نظریۂ رنگ و نور

خواجہ شمس الدین عظیمی

نظریۂ رنگ و نور

خواجہ شمس الدّین عظیمی

الکتاب پبلی کیشنز
۱-کے-۵، ناظم آباد نمبر ۱- کراچی

اشاعت ---------------- فروری 1995ء

تعداد ---------------- 1000

قیمت ---------------- Rs. [redacted]

الکتاب پبلی کیشنز

طباعت اور اشاعت پاکستان میں کی گئی

انتساب

زمان و مکان (Time & Space) ایک لمحے کی تقسیم در تقسیم ہے اور لمحہ کی تقسیم، اطلاع ہے جو ہر آن لہروں کے ذریعہ انسانی دماغ پر وارد ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم ان اطلاعات کا مخزن (Source of Information) معلوم کرنا چاہیں تو اس کا ذریعہ روحانی علوم ہیں اور روحانی علوم کے لئے دانشوروں کو بہرحال قرآن میں تفکر کرنا پڑے گا۔

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

زمین ہماری ہے

جب ہم اپنی زمین، چاند، سورج، کہکشانی نظام اور کائنات کی ساخت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام ایک قاعدے، ضابطے اور قانون کے تحت کام کررہا ہے اور یہ قانون اور ضابطہ ایسا مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات میں موجود کوئی شے اس ضابطہ اور قاعدے سے ایک انچ کے ہزارویں حصے میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتی۔ زمین اپنی مخصوص رفتار سے محوری اور طولانی گردش کررہی ہے۔ اس کو اپنے مدار پر حرکت کرنے کے لئے بھی ایک مخصوص رفتار اور گردش کی ضرورت ہے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ پانی کا بہنا، بخارات بن کر اڑنا، شدید ٹکراؤ سے اس کے Molecules کا ٹوٹنا، بجلی کا پیدا ہونا اور ماحول کو منور کرنا یہ سب ایک مقررہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہے۔ اسی طرح حیوانات، نباتات کی پیدائش اور افزائش بھی ایک لگے بندھے قانون کی پیروی کررہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی پیدائش اور نشوونما کا نظام ایک ہی چلا آرہا ہے۔ وہ پیدا ہوکر بڑھتا ہے، لڑکپن اور جوانی کے زمانوں سے گذر کر بڑھاپے کے دور میں داخل ہوجاتا ہے۔ غورطلب

بات یہ ہے کہ کوئی نہیں چاہتا کہ میں بوڑھا ہوجاؤں لیکن ہر شخص بوڑھا ہونے پر مجبور ہے۔ کوئی شخص پسند نہیں کرتا کہ اس کے اوپر موت وارد ہو لیکن دنیا میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ آدمی نے موت سے نجات حاصل کرلی ہو۔ ان باتوں پر گہرے غور و خوض کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس قدر منظم و مربوط نظام کو چلانے والی کوئی ہستی ضرور موجود ہے۔

کوئی اس ہستی کو بھگوان کہتا ہے، کوئی اس لازوال ہستی کا نام God رکھتا ہے۔ کسی صحیفے میں اسے نروان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ آسمانی کتابوں میں اس کا نام اللہ ہے۔ نام کچھ بھی رکھا جائے بہر حال ہم یہ ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایک طاقتور اور لامتناہی ہستی ہمیں سنبھالے ہوئے ہے اور ساری کائنات پر اس کی حکمرانی ہے۔ وہ لوگ جو اس عظیم ہستی کا اقرار نہیں کرتے وہ زندگی کی شکست و ریخت کا ذمہ دار Nature کو قرار دیتے ہیں، درحقیقت ان کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو نمایاں ہے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی چیز موجود نہیں ہوتی اس کا انکار اور اقرار زیر بحث نہیں آتا۔ کوئی بندہ جب اپنی دانست میں اس ہستی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو اس کا ذہن انکار کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

ہر شے کسی نہ کسی پروگرام کے ساتھ تخلیق ہوئی ہے۔

بلامقصد یا تحصیل کے طور پر کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ عام طور پر انسان کی تمام دلچسپیاں گوشت پوست کے جسم پر مرکوز رہتی ہیں جبکہ گوشت پوست کا جسم اصل نہیں ہے اصل انسان وہ ہے جو اس جسم کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔

ہم اپنے مادی جسم کی حفاظت کے لئے لباس بناتے ہیں۔ لباس خواہ کسی Material کا ہو جب تک گوشت پوست کے جسم پر موجود ہے اس میں حرکت ہے۔ لباس کی حرکت جسم کے تابع ہے لباس میں اپنی ذاتی کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب آدمی مر جاتا ہے تو لباس کی طرح اس کے اندر بھی کوئی ذاتی حرکت یا قوت مدافعت موجود نہیں رہتی۔ ہم گوشت پوست کے جس جسم کو انسان کہتے ہیں وہ انسان نہیں ہے۔ بلکہ اصل انسان کا لباس ہے۔

نظریہ رنگ و نور اور---- عقل و شعور ہمیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم تلاش کریں کہ انسان کی اصل کیا ہے۔ وہ کہاں سے آکر اپنے لئے جسمانی لباس تیار کرتا ہے اور پھر اس لباس کو اتار کر کہاں چلا جاتا ہے۔ قدرت نے انسان کو اصل انسان سے متعارف کرانے کے لئے بہت اہم اور مختصر فارمولے بنائے ہیں تاکہ نوع انسانی خود آگاہی حاصل کر کے اپنی اصل سے

واقف ہوجائے۔

ہر مخلوق باشعور اور باحواس ہے، اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے قائم، زندہ اور متحرک ہے۔ نباتات، جمادات آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ نباتات، جمادات اور زمین پر موجود دوسری مخلوق کی آپس میں گفتگو ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ زمین اور زمین کے اندر تمام ذرات شعور رکھتے ہیں۔ زمین ایک ماں کی طرح تخلیقی قوتوں کی حامل ہے۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو جنم دیتی ہے اسی طرح زمین تخلیقی عوامل سے گذر کر ایسے ایسے رنگ بکھیرتی ہے۔ جو عقل و دانائی کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ دھوپ ایک ہے، ہوا ایک ہے، چاندنی ایک ہے اور فضا میں بکھری ہوئی Gases ایک ہیں مگر جب پانی زمین کی کوکھ میں جذب ہوجاتا ہے تو اتنی تخلیقات ظہور پذیر ہوتی ہیں جن کا شمار انسان کے بس سے باہر ہے۔ زمین کے پیٹ میں کروڑوں سانچے ہیں۔ جس سانچے میں پانی ٹھہر جاتا ہے پانی Dye کے مطابق نیا روپ اختیار کرلیتا ہے۔ یہی پانی کبھی کیلا بن جاتا ہے، کبھی سیب بن جاتا ہے، کبھی انگور بن جاتا ہے اور کبھی پھولوں کے نقش ونگار بن کر سامنے آجاتا ہے۔ برگد کا ایک بیج جو خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے جب زمین کے پیٹ میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین اس بیج کو پرورش کرکے تناور درخت بنادیتی ہے۔ ایسا تناور

درخت جس کے سائے میں سینکڑوں آدمی قیام کرتے ہیں۔ زمین پر موجود پھیلی ہوئی مادی کائنات نے انسان کو اس بات کا شعور بخشا ہے کہ انسان اپنی عقل و شعور کو استعمال کرے اور یہ سوچے کہ انسان حیوانات، نباتات اور جمادات سے کس طرح ممتاز ہے۔

سائنسی دنیا نے جو علمی اور انقلابی ایجادات کی ہیں ان ایجادات میں Physics اور Psychology سے آگے Parapsychology (روحانیت) کا علم ہے۔ روحانیت دراصل تفکر، فہم اور ارتکاز کے فارمولوں کی دستاویز ہے۔ اس دستاویز کا مطالعہ کرنے کا بہترین ذریعہ مراقبہ Meditation ہے۔

مراقبہ کیا ہے ؟

مراقبہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں روحانیت کے اس قانون کو سمجھنا ہوگا جو قانون مادی دماغ سے ہٹ کر نگاہ یا ویژن Vision کے اصول و ضوابط پر مشتمل ہے۔ ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ کوئی چیز ہمارے سامنے ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے برعکس روحانیت ہمیں بتاتی ہے کہ پہلے ہمارے اندر شے کا عکس بنتا ہے پھر ہم شے کو دیکھتے ہیں۔ ہم براہ راست کسی چیز کو نہیں دیکھتے بلکہ دماغ کے دیکھنے کو ذہن کی اسکرین پر دیکھتے ہیں۔ روحانیت ایک ایسا میکانیکی نظام ہے جس

کی گراریاں لہروں کے اوپر چل رہی ہیں۔ روحانیت کا طالب علم جب اپنی ذہنی توجہ ایک نقطہ پر مرکوز کردیتا ہے تو اس کے اندر موجود غیب کی دنیا میں داخل ہونے کی صلاحیت بیدار اور متحرک ہوجاتی ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ روحانیت کا طالبعلم آنکھیں بند کرکے خاموش بیٹھا ہے مگر وہ ظاہری حواس کے ساتھ باطنی حواس میں بھی سفر کرتا ہے اور اس سفر میں غیب کی دنیا اس کے سامنے ہوتی ہے۔

ENERGY

تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق اللہ ایسا خالق ہے جس کی تخلیق میں وسائل کی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جس خدوخال میں موجود ہے جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتا ہے تو حکم دے دیتا ہے تخلیق اپنے پورے وسائل کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے۔

سب سے بہتر خالق ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں۔ اللہ کی تخلیق کے علاوہ دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔ سائنس دانوں نے بجلی سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں، کھربوں چیزیں وجود میں آگئیں۔

اللہ کا وصف یہ ہے کہ اللہ نے ایک لفظ ''کن'' کہہ کر بجلی کو وجود بخش دیا۔ آدم زاد نے اختیاری طور پر جب بجلی کے علم میں تفکر کیا تو اس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آگئیں۔ بجلی سے جو چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے اللہ کی اس تخلیق میں سے دوسری تخلیقات کا مظہر بننا دراصل نوع انسانی کا بجلی کے اندر تصرف ہے۔ یہ وہی علم

ہے جو اللہ نے آدم کو سکھادیا تھا۔ اللہ نے آدم کو ایسا علم سکھادیا ہے جو براہ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ جب انسان اس علم کو حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کائنات کیا ہے ؟

کائنات ایک علم ہے۔ ایسا علم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ نے نوع انسانی کو واقف کردیا ہے۔ اس وقوف کو حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ روح کے اندر تفکر کیا جائے۔

اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے

"ہم نے لوہا نازل کیا اور اس کے اندر انسانوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ کردیئے ہیں"۔

جن لوگوں نے لوہے کی صفات میں تفکر کیا ان کے سامنے لوہے کی لامحدود صلاحیتیں آگئیں اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کرکے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کردیا گیا تو لوہا ایجادات کا ذریعہ بن گیا۔ موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح لوہے سے وابستہ ہے۔ جس طرح لوہا ایک وجود ہے اسی طرح روشنی بھی ایک وجود ہے۔

وسائل کی حدود سے گذر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرلیتا ہے وہ بہت

ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔ اللہ اپنی تخلیق میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جب وہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو تخلیق کے لئے جتنے وسائل موجود ہونا ضروری ہیں وہ از خود وجود میں آجاتے ہیں۔ بندے کا تصرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنانا اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرف کر کے کسی چیز کو وجود میں لانا ہے۔ یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے ان روشنیوں کو متحرک کر کے کسی چیز کو تخلیق کرنا، روحانی دنیا میں ان روشنیوں کا نام "نسمہ" ہے، سائنسی دنیا میں ان روشنیوں کو Aura کہا جارہا ہے۔ جب کوئی بندہ روشنیوں کے اس علم کو جان لیتا ہے تو اس کے اوپر تخلیقی فارمولے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ انسان ایک ایسی تخلیق ہے جو اللہ کی تخلیق میں تصرف کرنے کی قدرت رکھتی ہے اور یہ علم اسے اللہ کی طرف سے منتقل ہوا ہے۔ اللہ یہ بات جانتے ہیں کہ انسان سے ذیلی تخلیقات وجود میں آتی رہیں گی اس لئے اللہ نے اپنے لئے کہا ہے

"میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔"

انسانی زندگی تین دائروں میں تقسیم ہے۔ مادی، ذہنی اور ماورائے ذہنی۔ مادی زندگی کا طبعیات سے تعلق ہے۔ ذہنی دائرے

کا نفسیات سے اور ماورائے ذہنی دائرے کا تعلق مابعد النفسیات سے ہے۔

نظریہ رنگ و نور کے مطابق، مابعد النفسیات میں، طبعیات اور نفسیات سے ہٹ کر ان ایجنسیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کائنات کی مشترک سطح میں عمل پیرا ہیں اور کائنات کے قوانین عمل کا احاطہ کرتی ہیں۔ نظریہ رنگ و نور اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان کائنات کی تخلیق میں کام کرنے والے فارمولوں سے کہاں تک واقف ہے۔ یہ فارمولے اس کی دسترس میں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس حد تک ہیں۔ انسان کے لئے ان کی افادیت کیا ہے اور ان سے آگاہی حاصل کرکے وہ کس طرح زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بناسکتا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات سے قائم ہے۔ کوئی خیال ہمارے لئے مسرت آگیں ہوتا ہے اور کوئی خیال انتہائی کربناک۔

نظریہ رنگ و نور کے مطابق ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں، دماغ کے بھی دو رخ ہیں، ایک رخ وہ جو سر کے سیدھی طرف ہے اور دوسرا رخ وہ جو سر کے بائیں ظرف ہے۔ دونوں حصے یا دونوں دماغ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں فرق یہ ہے کہ ایک حصے

کی کارکردگی بیداری کے حواس بناتی ہے اور دوسرے حصہ کی کارکردگی سے رات کے حواس بنتے ہیں۔

سیدھی طرف کا دماغ شعور ہے اور الٹی طرف کا دماغ لاشعور ہے۔ جب تک کوئی بات یا کوئی عمل صرف شعور کے دائرے کار میں رہتا ہے وہ چیز زیادہ دیر محفوظ نہیں رہتی اور بھول کے خانے میں جا پڑتی ہے۔ اگر کوئی کام کوئی عمل شعور کی سطح سے گذر کر لاشعور میں داخل ہوجاتا ہے تو یہ کام فہم و فراست کے ساتھ حافظہ کے اوپر نقش ہوجاتا ہے۔

جب ہم کوئی کتاب، کورس کا کوئی مضمون سطحی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس میں سبق کا رٹنا بھی شامل ہے تو شعور کی سطح سے وہ آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن اگر ہم یہی سبق اور یہی مضمون غوروفکر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ پڑھتے ہیں تو وہ لاشعور کی حدود میں چلا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یاد رہتا ہے۔ اللہ نے آدم کو زمین میں اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ آدم کو نیابت اس وقت منتقل ہوئی جب اللہ نے آدم کو "علم الاسماء" سکھایا۔ اللہ کی طرف سے اس انتظامی امور کو سمجھنا اور اللہ کے دیئے ہوئے "علم الاسماء" کی روشنی میں ان انتظامی امور کو چلانا نیابت کے دائرے میں آتا ہے۔ انسان کو بحیثیت خلیفۃ اللہ "علم الاسماء" کی حکمت، تکوین کے اسرار و رموز اس لئے سکھائے گئے کہ وہ نئی نئی تخلیقات وجود میں

لاتا رہے۔

اللہ نے ہر چیز کی تخلیق کے فارمولے بنائے ہیں اور ہر فارمولا معین مقداروں کے تحت کام کررہا ہے، اللہ کی کتاب میں ہے

"ہم نے ہر چیز کو معین مقداروں سے تخلیق کیا ہے۔"

ہم یہ بتاچکے ہیں کہ اصل انسان روح ہے۔ ظاہر ہے روح اضطراب، کشاکش، احساس محرومی اور بیماریوں سے ماوراء ہے۔ روح اپنے اور جسم کے درمیان ایک میڈیم بناتی ہے۔ اس میڈیم کو ہم جسم انسانی اور روح کے درمیان نظر نہ آنے والا جسم کہہ سکتے ہیں۔ یہ غیر مرئی انسان بھی با اختیار ہے۔ اسکو یہ اختیار ہے کہ روح کی فراہم کردہ اطلاعات کو اپنی مرضی سے معنی پہنادے۔ جس طرح معیّن فارمولے کام کرتے ہیں۔ اسی طرح روح اور جسم کے درمیان نظر نہ آنے والا جسم بھی فارمولوں کے تحت متحرک اور باعمل ہے۔ اس میں اربوں، کھربوں فارمولے کام کرتے ہیں جن کو ہم چار عنوانات میں تقسیم کرتے ہیں۔

Water Energy

Electric Energy

Heat Energy

Wind Energy

روحانیت کا طالبعلم اس علم پر جتنی دسترس حاصل کرلیتا ہے

اتنا ہی اسے سکون مل جاتا ہے۔

خوف و غم کی جگہ اطمینان قلب؛ محرومی کی جگہ کامیابیاں اور شعور کی محدود درجہ بندی سے نکل کر ماورائی دنیا کے شب و روز اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

طرز فکر

انسان کا ذہن اور طرز فکر ماحول سے بنتی ہے۔ جس قسم کا ماحول ہوتا ہے۔ اسی طرز کے نقوش کم و بیش ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں۔ جس حد تک یہ نقوش گہرے یا ہلکے ہوتے ہیں اسی مناسبت سے انسانی زندگی میں طرز فکر کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں والدین اور اس کے اردگرد ماحول کے لوگ ذہنی پیچیدگی، بد دیانتی اور تمام ایسے اعمال کے عادی ہوں جو دوسروں کے لئے ناقابل قبول اور ناپسندیدہ ہیں تو بچہ لازمی طور پر وہی طرز فکر قبول کرلیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی بچے کا ماحول پاکیزہ ہے تو وہ پاکیزہ نفس ہوگا۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ بچہ وہی زبان سیکھتا ہے جو ماں باپ بولتے ہیں، وہی عادات و اطوار اختیار کرتا ہے جو اسکے والدین سے ورثہ میں اسے منتقل ہوتے ہیں۔ بچہ کا ذہن آدھا والدین کا ورثہ ہوتا ہے اور آدھا ماحول کے زیر اثر بنتا ہے۔ یہ مثال صرف بچوں کے لئے مخصوص نہیں افراد اور قوموں پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم جو کچھ ہوچکا ہے، ہورہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب کا سب نوع انسانی کا ورثہ ہے اور یہی ورثہ


آدم کا شعور
اسلاف کا شعور
قوم کا شعور
تاریخی حالات
وواقعات کا شعور
فرد کا شعور
ماحول کا شعور
والدین کا شعور
بچے کا شعور

قوموں میں اور افراد میں منتقل ہورہا ہے اور ہوتا رہیگا۔

قانون :

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شعوری طور سے کورا کاغذ ہوتا ہے لیکن اس کے اندر شعور کی داغ بیل پڑچکی ہوتی ہے۔ شعور کی یہ داغ بیل ماں، باپ کے شعور سے بنتی ہے۔ یعنی ماں کا شعور اور باپ کا شعور ملکر بچہ کا شعور بنتا ہے۔ یہی شعور بتدریج زندگی کے تقاضوں اور حالات کے رد و بدل کے ساتھ ضرب ہوتا رہتا ہے۔

1۔ بچہ کا شعور + والدین کا شعور + ماحول کا شعور = فرد کا شعور

2۔ فرد کا شعور + تاریخی حالات و واقعات کا شعور + قوم کا شعور = اسلاف کا شعور

3۔ اسلاف کا شعور + قوم کا شعور = آدم کا شعور

ہمارے شعور میں آدم کا شعور شامل ہے اور یہ جمع در جمع ہوکر ارتقائی شکل و صورت اختیار کررہا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب دو چیزیں ایک دوسرے میں باہم مل کر جذب ہوجاتی ہیں تو نتیجے میں تیسری چیز وجود میں آجاتی ہے۔

پانی میں شربت ملانے سے شربت بن جاتا ہے۔ پانی میں اتنی حرارت شامل کردی جائے جو آگ کے قریب ترین ہو تو پانی کی وہی صفات ہوجائیں گی جو آگ کی ہوتی ہیں اور اگر پانی میں اتنی سردی شامل کردی جائے جو برف کی ہے تو پانی کی وہی خصوصیات ہوجائیں گی جو برف کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب ماں اور باپ کا شعور جذب ہوتا ہے تو نتیجہ میں تیسرا شعور وجود میں

آتا ہے جس کو ہم بچہ کہتے ہیں۔

انسانی ارتقاء مسلسل اور متواتر شعور کی منتقلی کا نام ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ غاروں میں رہتے تھے پھر لوگ پتھر کے زمانے میں آگئے اور اس کے بعد پتھر کے وہی ہتھیار یا ضروریات زندگی کا سامان دوسری دھاتوں میں منتقل ہوتا رہا۔

علی ھذا القیاس نوع انسانی اسی ورثہ پر چل رہی ہے جو اسکو آدمؑ سے منتقل ہوا ہے۔ آدمؑ نے نافرمانی کی اولاد کو نافرمانی کا ورثہ منتقل ہوگیا۔ آدمؑ نے عجز و انکسار کے ساتھ عفو درگزر کی درخواست کی، یہ طرز فکر بھی آدمؑ کی اولاد میں منتقل ہوگئی۔

نظریہ رنگ و نور کے مطابق دیکھنے کی طرزیں دو ہیں۔ ایک دیکھنا براہ راست ہوتا ہے اور ایک دیکھنا بالواسطہ۔ براہ راست دیکھنے سے منشاء یہ ہے کہ جو چیز دیکھی جارہی ہے وہ کسی میڈیم کے بغیر دیکھی جارہی ہے۔ بالواسطہ دیکھنے کا مطلب ہے کہ جو چیز ہمارے سامنے ہے وہ ہم کسی واسطے سے دیکھ رہے ہیں۔

کائنات میں جو کچھ ہے، جو کچھ تھا، جو کچھ ہورہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے وہ سب کا سب ریکارڈ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام حواس دراصل ریکارڈ ہیں۔ اگر بھوک پیاس حواس ریکارڈ نہ ہوں تو بھوک پیاس کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ بھوک پیاس کا تقاضہ ایک اطلاع ہے جب اس اطلاع میں معنی شامل کرلئے جاتے ہیں تو یہ بالواسطہ طرز فکر بن جاتی ہے۔ اس کی مثال

بہت آسان ہے۔ ایک آدمی آنکھوں پر چشمہ نہیں لگاتا وہ جو کچھ دیکھتا ہے براہ راست دیکھتا ہے۔ دوسرا آدمی آنکھوں پر چشمہ لگاتا ہے وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اس کے دیکھنے میں گلاس واسطہ ہے۔ اس مثال کو اور زیادہ گہرائی میں سمجھا جائے تو اس طرح کہا جائیگا کہ عینک میں اگر سرخ رنگ کا گلاس ہے تو ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔ نیلا گلاس ہے تو ہر چیز نیلی نظر آتی ہے۔ حالانکہ شئے نہ نیلی ہے اور نہ سرخ ہے۔ جب ہم کسی رنگین شیشے کو دیکھنے کے لئے واسطہ بنائیں گے تو نظر وہی دیکھے گی جو ہمیں شیشہ دکھائے گا۔

طرز فکر اور نظر کا قانون ایک ہی بات ہے۔ ایک طرز فکر ایسی ہے جو بالواسطہ کام کرتی ہے اور ایک طرز فکر یہ ہے کہ براہ راست کام کرتی ہے۔ کوئی آدمی اگر کسی ایسے شخص کی طرز فکر کو اپنے لئے واسطہ بناتا ہے جس کی طرز فکر براہ راست کام کررہی ہے تو اس شخص کے اندر وہی طرز فکر منتقل ہوجاتی ہے۔

"براہ راست طرز فکر" طالب علم کے اندر منتقل کرنے کا ایک مسلسل عمل ہے۔ جتنے پیغمبر تشریف لائے ان سب کی طرز فکر یہی تھی کہ ہمارا رشتہ ماورائی ہستی کے ساتھ براہ راست قائم ہے اور یہی رشتہ کائنات کی جان ہے۔ دنیا میں جتنے ہادی آئے ان کی تعلیمات بھی یہی رہیں کہ بندے کے ذہن میں یہ

بات نقش ہوجائے کہ بندہ ایک ماورائی ہستی کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ تمام انبیاء نے اسی طرز فکر کو مستحکم کرنے کے لئے نوع انسانی کو اچھائی اور برائی کا تصور عطا کیا ہے۔ اگر اچھائی اور برائی کا تصور عطا کیا ہے۔ اگر اچھائی اور برائی کا تصور نہ ہو تو نیکی اور برائی دونوں عمل ناقابل تذکرہ ہوجائیں گے۔

شیطان کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ شیطان کو ہم اللہ کی تخلیق کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن شیطان زندگی کا ایک ایسا وصف ہے جو اللہ کے لئے ناپسندیدہ ہے اور شیطنت کے برعکس اللہ کے احکامات کی بجا آوری اللہ کے لئے پسندید عمل ہے۔

ایک طالب علم جو باشعور ہے اور دوسرے علم میں اعلی مہارت رکھتا ہے۔ جب روحانیت کا علم حاصل کرنا چاہے گا تو اس کے اندر بچے کی افتاد طبعیت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ روحانیت میں اسکی حیثیت ایک بچے سے زیادہ نہیں ہے۔

امام غزالیؒ کا بڑا مشہور واقعہ ہے آپ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار عالم اور دانشور تھے۔ بڑے بڑے جید علماء انکے علوم سے استفادہ کرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انکو خیال آیا کہ خانقاہی نظام (روحانی درسگاہ) کو بھی دیکھنا چاہئیے۔ انہوں نے دور دراز کا سفر کیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کسی نے پوچھا آپ ابوبکر شبلیؒ سے بھی ملے ہیں۔ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ میں نے اب تک روحانی مکتبہ فکر کا کوئی مشہور آدمی نہیں چھوڑا جس سے ملاقات

نہ کی ہو۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کہانیاں ہیں جو لوگوں نے اپنے بارے میں مشہور کر رکھی ہیں۔ پھر انہیں خود ہی خیال آیا کہ ایک مشہور آدمی رہ گیا ہے اس سے بھی کیوں نہ ملاقات کرلی جائے۔

قصہ کوتاہ، وہ ملاقات کے لئے عازم سفر ہوئے اور حضرت شبلیؒ سے ملاقات کی۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ اس وقت مسجد کے صحن میں بیٹھے گدڑی سی رہے تھے۔ امام غزالیؒ حضرت ابوبکر شبلیؒ کی پشت کی جانب کھڑے ہوگئے۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر فرمایا کہ غزالی آگیا تو نے بہت وقت ضائع کردیا ہے۔ علم سیکھنے کے لئے پہلے عمل کیا جاتا ہے پھر علم آتا ہے۔ اگر تو اس بات پر قائم رہ سکتا ہے تو میرے پاس قیام کر ورنہ واپس چلا جا۔ امام غزالیؒ نے ایک منٹ توقف کیا اور کہا "میں آپ کے پاس قیام کروں گا"۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا کہ سامنے مسجد کے کونے میں جاکر کھڑا ہوجا امام غزالیؒ نے حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دیر کے بعد بلایا، دعا سلام کے بعد اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بہت خاطر مدارت کی۔ امام غزالیؒ بہت خوش ہوئے کہ مجھے بہت اچھا روحانی استاد مل گیا ہے۔ جس نے میرے اوپر آرام و آسائش کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ چند روز بعد حضرت شبلیؒ نے امام غزالیؒ سے فرمایا۔ "بھائی اب کام شروع ہوجانا چاہئے اور کام کی ابتداء یہ ہے کہ ایک بوری کھجور لیکر شہر کے

بازار میں بیٹھ جاؤ اور بوری کھول کر یہ اعلان کردو کہ جو آدمی میرے سر پر ایک چپت رسید کرے گا اسے ایک کھجور ملے گی۔"

امام غزالیؒ تین سال تک بازار میں کھجور کی مفت دکان لگائے بیٹھے رہے اور ان تین سال تک ان کے سر پر چپت لگتے رہے۔ تین سال کی مدت پوری ہوگئی تو حضرت ابوبکر شبلیؒ نے امام غزالیؒ کو وہ علم منتقل کردیا جس کی تلاش میں وہ سالہا سال سے سرگرداں تھے۔ امام غزالیؒ جب بغداد واپس پہنچے تو صورتحال یہ تھی کہ معمولی کپڑے زیب تن تھے، ہاتھ میں ایک ڈول تھا، ڈول میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ شہر والوں کو جب علم ہوا کہ امام غزالیؒ واپس تشریف لارہے ہیں تو انکے استقبال کے لئے پورا شہر امڈ آیا۔ لوگوں نے جب انہیں عام لباس میں دیکھا تو حیران و پریشان ہوئے اور کہا۔ "یہ آپ نے کیا صورت بنا رکھی ہے۔" امام غزالیؒ نے فرمایا "اللہ کی قسم! اگر میرے اوپر یہ وقت نہ آتا تو میری زندگی ضائع ہوجاتی۔" امام غزالیؒ کے الفاظ بہت فکر طلب ہیں۔ اپنے زمانے کا یکتا عالم فاضل، دانشور یہ کہہ رہا ہے کہ روح کا سراغ نہ ملتا تو زندگی ضائع ہوجاتی۔

امام غزالیؒ کھجور کی تقسیم پر علمی مناظرہ شروع کر دیتے تو انہیں یہ علم حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

یہی صورتحال آسمانی علوم کی ہے۔ طالب علم کے اندر جب تک اپنی انا کا علم موجود ہے وہ آسمانی علوم نہیں سیکھ

سکتا۔ مسلمان جب کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو پہلے اللہ کی نفی کرتے ہیں پھر اللہ کا اقرار کرتے ہیں۔ لا الہ کوئی معبود نہیں۔ الا اللہ مگر اللہ، اس کی عام تفسیر تو یہ ہے کہ حضور اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی بعثت کے زمانے میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی لوگ بتوں کو خدا مانتے تھے۔ لا الہ کا مفہوم یہ ہوا کہ بت معبود نہیں مگر اللہ معبود ہے۔ باریک بین نظر اور گہرے تفکر اور براہ راست طرز فکر سے غور کیا جائے تو اس کی تشریح یہ ہوگی کہ لا الہ ہمارے شعوری علوم کے احاطہ میں اللہ کے جاننے کی جو طرز ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور اللہ کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ خود کو اللہ کہتا ہے۔ محمد علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کے پیغامبر ہیں۔ محمد الرسول اللہ علیہ الصلوۃ والسلام نے اللہ کو جس طرح جانا اور جس طرح بتایا ہم اسی طرح اللہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ پہلے ہم نے اپنے علم کی نفی کی پھر علم کا اثبات کیا۔ علم کی نفی کی تو اپنی نفی کی اور جب اپنی نفی کی تو اللہ کے سوا کچھ باقی نہ بچا۔

ممتاز معاشرہ

نظریہ رنگ و نور ہمارے اوپر منکشف کرتا ہے کہ روحانیت پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ماورائی علوم کا تذکرہ تو کیا گیا ہے لیکن اس علم کو ایک جمع ایک = دو اور دو جمع دو = چار کی طرح عام نہیں کیا گیا۔ بہت سے رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں لیکن بے شمار اسرار پردے میں ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ماورائی علوم چونکہ منتقل ہوتے ہیں اس لئے ان کو محفوظ رہنا چاہئیے اور ان کی حفاظت کرنی چاہئیے۔ روحانی علوم حاصل ہونے کے بعد ان کے نتائج (مافوق الفطرت باتوں) کو چھپا لینا چاہئیے۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کے اندر سوچنے سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت اتنی موجود نہ تھی جتنی آج موجود ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور سے پہلے دور دراز آوازوں کا پہنچنا کرامت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب سائنس دانوں نے آواز کا طول موج دریافت کرلیا ہے۔ خیالات کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بھی کرامت (مافوق الفطرت) بیان کیا جاتا تھا۔ آج کی دنیا میں ہزاروں میل کے فاصلے پر پوری پوری تصویریں منتقل ہوجاتی

ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں صرف پچاس سال پہلے لوگوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ آدمی روشنیوں کا بنا ہوا ہے تو لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ آج سائنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آدمی لہروں کا مرکب ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے یہ بات بتادی کہ آدمی لہروں سے مرکب ہے بلکہ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی جگہ سے گذر جانے کے بعد تصویر لی جاسکتی ہے۔

پہلے زمانے میں دادی اور نانی بچوں کو اڑن کھٹولوں کے قصے سنایا کرتی تھیں کہ ایک اڑن کھٹولہ تھا اس پر ایک شہزادی اور شہزادہ بیٹھے اور اڑ گئے۔ نانی اور دادی کے اڑن کھٹولہ (ہوائی جہاز) آج ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ ہم اس میں بیٹھ کر اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق سفر بھی کرتے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سائنس کی ترقی سے پہلے نوع انسانی کی صلاحیت اتنی نہیں تھی کہ ماورائی رموز و نکات اس کی سمجھ میں آجاتے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی سائنس کے ماہرین پہلے چند لوگوں کا انتخاب کرتے تھے اور ان کو علوم منتقل کردیئے تھے لیکن اس دور میں انسان کی دماغی صلاحیت اور تفکر اتنا زیادہ ہے کہ جو چیزیں پہلے کشف و کرامات سمجھی جاتی تھیں اب وہ باتیں انسان کی عام زندگی میں داخل ہو گئی ہیں۔ جیسے جیسے علوم کے ذریعے انسان کی سکت بڑھتی گئی، شعور طاقتور ہوتا گیا۔ ذہانت میں اضافہ ہوا۔ گہری باتوں کو سمجھنے اور جاننے کی سکت

بڑھی۔ سائنس کی ترقی سے یہ نقصان بھی ہوا .... کہ جیسے جیسے شعور کی طاقت بڑھی اسی مناسبت سے آدمی کے اندر یقین کی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی۔

یقین کی طاقت کمزور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ماوراء ہستی سے دور ہوتا چلاگیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کا مطمع نظر زیادہ تر دنیاوی آسائش و آرام کا حصول بن گیاہے۔ دنیا چونکہ بے یقینی کا سمبل اور فکشن ہے اور مفروضہ حواس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے یہ ترقی بھی نوع انسان کے لئے عذاب بن گئی۔ اگر اس ترقی کی بنیاد ظاہری اسباب کے ساتھ ماورائی صلاحیت کی تلاش ہوتی تو یقین کمزور ہونے کے بجائے طاقتور ہوتا۔ اس کے باوجود سائنسی علوم کے پھیلاؤ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ نوع انسانی کے اندر ماورائی علوم حاصل کرنے کا ذوق پیدا ہوا ہے۔

پچاس یا سو سال پہلے جو صلاحیت پچاس پچاس ، سو سو سال کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی تھی اب وہ صلاحیت ارادہ کے اندر یقین مستحکم ہونے سے چند مہینوں میں بیدار اور متحرک ہوجاتی ہے۔

ماورائی زندگی میں داخل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کھانا نہ کھائے، پانی نہ پیئے، کپڑے نہ پہنے، اس کے دوست احباب نہ ہوں یہ سب اس لئے ہونا ضروری ہے کہ دنیا کو وجود

بخشنے والی ماورائی ہستی اس دنیا میں رونق دیکھنا چاہتی ہے۔ اس دنیا کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اس دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔ اسباب و وسائل جب تک دنیا میں موجود ہیں، دنیا موجود رہے گی۔ جو وسائل موجود ہیں وہ پیدا ہوتے رہیں گے اور ان سے دنیا میں رہنے والوں کو فائدہ پہونچتا رہے گا۔

نظریہ رنگ و نور اس بات کا درس دیتا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے سارے کام پورے کئے جائیں۔ اچھا کھانا کھایئے، بہترین لباس پہنیئے، چٹنی کے ساتھ مرغ بھی کھایئے۔ لیکن ہر کام اور ہر عمل کا رخ اس ذات مطلق کی طرف موڑ دیجیئے جس نے یہ دنیا بنائی۔ کھانا اس لئے کھایئے کہ اللہ چاہتا ہے کہ بندہ کھانا کھائے، بندے کھانا نہیں کھائیں گے تو دنیا ویران ہوجائے گی۔ پانی اس لئے پئیں کہ اللہ چاہتا ہے کہ بندہ پانی پیئے تاکہ اللہ کا لگایا ہوا باغ (دنیا) سر سبز و شاداب رہے۔ آپ بیوی بچوں سے محبت کریں لیکن یہ محبت اس لئے کریں کہ اللہ چاہتا کہ بیوی بچوں سے محبت کی جائے تاکہ ان کی صحیح تربیت ہو اور وہ حیوانات سے ممتاز ہوکر زندگی گزاریں۔ ماوراء ہستی چاہتی ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کریں کہ انسانی اقدار عام ہوں اور بھیڑ بکریوں سے ممتاز ایک معاشرہ قائم ہو۔

روزمرہ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ روزی اور رزق کا حاصل کرنا ہے، اس لئے کہ رزق حاصل کئے بغیر زندگی

ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہماری زندگی مختلف مراحل اور زمانوں سے مزین ہے۔ زندگی کے قیام کا پہلا زمانہ یا مرحلہ ایسی بند کوٹھری ہے جس میں بظاہر نہ ہوا کا گذر ہے اور نہ ہی اس کوٹھری میں انسان کے اپنے ارادے اور اختیار سے کھانے پینے کی چیزیں مہیا ہوتی ہیں اور نہ ہی اس کوٹھری میں رہتے ہوئے وہ اپنی روزی حاصل کرنے کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے۔ لیکن اسے رزق ملتا ہے اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس نشو و نما کا دور نو 9 مہینے کی زندگی پر مشتمل ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ بتدریج اور توازن کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور اس کی ساری غذائی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ نو مہینے کے بعد مکمل آدمی کی شکل و صورت اختیار کرکے بچہ اس بند کوٹھری سے باہر آجاتا ہے۔ اب بھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اپنی ضروریات خود پوری کرسکے۔ اسکی زندگی کو نشو و نما دینے کے لئے ماوراء ہستی نے ماں کے دل میں محبت ڈال دی اور ساتھ ہی ماں کے سینے کو اس بچے کے لئے دودھ کا چشمہ بنادیا۔ بچہ بغیر کسی جد و جہد کے غذا حاصل کرتا رہتا ہے اور اس کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ بچپن سے گذر کر لڑکپن کے زمانے میں بھی اس کی تمام ضروریات کا کفیل ماوراء ہستی نے اس بچہ کے ماں باپ کو بنادیا ہے۔ شعور کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد یہ انقلاب برپا ہوتا کہ وہ سوچتا ہے کہ مجھے رزق حاصل کرنے کے لئے کچھ کرنا ہوگا وہ اس تگ و دو

میں اپنی پچھلی ساری زندگی کو فراموش کردیتا ہے۔ ماوراء ہستی نے جس طرح ماں کے دل کو محبت سے معمور کردیا ہے اسی طرح زمین کے دل میں بھی اپنی مخلوق کی محبت ڈال دی اور اسے پابند کردیا کو وہ زمین پر آباد مخلوق کی خدمت کرے۔ اس طرح چاند اور سورج کو بھی خدمت گذاری کے لئے پابند کردیا ہے۔ زمین اگر اپنا ارادہ اور اختیار استعمال کر کے گیہوں نہ اگائے، سورج اپنی روشنی اور دھوپ سے گندم یا چاول کو نہ پکائے تو غذائی ضروریات پوری نہیں ہوں گی۔ جب زمین پر کوئی چیز پیدا نہیں ہوگی تو نوع انسان اور دوسری نوعین زندہ نہیں رہیں گی۔

روحانی طرز فکر کو اپنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ماوراء ہستی کی مخصوص طرز فکر کو قبول کیا جائے پھر طرز فکر والی ہستی سے تعلق قائم کرلیا جائے۔ یہ تعلق اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب طرز فکر حاصل کرنے والا اس ہستی کے عادات و اطوار کو اپنی عادات و اطورا بنالے اور جس کی طرز فکر حاصل کرنا مقصود ہو وہ بھی دوسرے آدمی کو اپنا قرب عطا کردے اور اس کو اپنی جان کا ایک حصہ سمجھے۔

ہمارے اندر جب کوئی تقاضہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی اطلاع وارد ہوتی ہے کہ جسم اپنی انرجی اور طاقت بحال رکھنے کے لئے کسی چیز کا مطالبہ کررہا ہے۔ ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ جسم کو گرم و سرد وسائل یا خوردونوش کی ضرورت ہے۔ اس نقطے پر ان

تمام چیزوں کے نقوش بن جاتے ہیں اور یہ نقوش ہی جسمانی نشوونما کی بنیاد بنتے ہیں۔ اسی صورت میں کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزوں کے اندر کام کرنے والی لہریں انسان کو اپنے اندر کھینچنے لگی ہیں۔

قانون :

ہم کہتے ہیں کہ ہم روٹی کھاتے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ گندم کے اندر روشنی یا Energy ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب ہم اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوجاتے ہیں تو ہمارے اندر کی بھوک گندم کے اندر جذب ہوجاتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہم چاول یا گندم نہیں کھاتے بلکہ چاول یا گندم ہمیں کھاجاتے ہیں۔ گندم کے اندر کشش ثقل موجود ہے، کشش ثقل ہمیں کھینچ لیتی ہے، ہم کشش ثقل کو نہیں کھینچتے۔ جب ہمارے اندر یہ تقاضہ پوری گہرائیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہوجاتا ہے تو ہمیں بھوک کا احساس ہوتا ہے۔ احساس سے مراد یہ ہے کہ اب ہم بغیر کھانا کھائے نہیں رہ سکتے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں کھانا مظہر بن جاتا ہے۔

روزمرہ کی زندگی، رہن سہن اور معاشرے میں رائج اخلاقی قوانین و ضوابط (طبعیات) سے ہر شخص اپنے علم کی حدود میں واقفیت رکھتا ہے۔ طبعیات کے بعد دوسرا علم جو عام ذہن سے اوپر کے درجے کا علم ہے۔ اہل دانش نے اس کا نام نفسیات رکھا

ہے۔ نفسیات میں وہ باتیں زیر بحث آتی ہیں جن پر طبعیات یا شعور کی بنیادیں قائم ہیں۔

ہر نوع میں بچے اپنی مخصوص نوع کے نقش و نگار پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بی آدمیوں سے کتنی ہی زیادہ مانوس ہو اسکی نسل بلی ہی ہوتی ہے۔ کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ بکری سے گائے پیدا ہوئی ہو یا گائے سے کبوتر پیدا ہوا ہو۔

شکم مادر میں ایک طرف نوعی تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماں اور باپ کے تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ ان تصورات میں متعین مقداریں کام کرتی ہیں۔

"بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کیا اور مقداروں کے ساتھ ہدایت بخشی۔" (قرآن)

یہ مقداریں ہی نوع کو الگ الگ کرتی ہیں۔ تخلیقی فارمولوں میں جب یہ مقداریں بکری کے رنگ و روپ میں تبدیل ہوتی ہیں تو بکری بن جاتی ہیں اور جب یہی مقداریں آدم کے نقش و نگار میں تبدیل ہوتی ہیں تو آدمی بن جاتا ہے۔

آدم زاد کروڑوں دنیاؤں میں آباد ہے

کسی علم یا فن کو سیکھنے کے لئے ہمیں استاد کی ضرورت پڑتی ہے جو قدم قدم ہماری رہنمائی کرکے ہمیں اس فن سے متعارف کراتا ہے جو ہم سیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی مصور اپنے شاگرد کی رہنمائی نہ کرے تو شاگرد مصوری کے فن میں کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ استاد کی رہنمائی میں شاگرد اپنے اندر چھپی ہوئی تصویر بنانے کی صلاحیت کو بیدار کرلیتا ہے۔ روحانی استاد اپنے شاگرد کے اندر پہلے روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے پھر اسے تعلیم دیتا ہے۔ ضروری ہے کہ روحانی استاد تلاش کرنے کے لئے شاگرد روحانی انسان کی صحبت اختیار کرے۔ اس کے شب و روز کا بغور مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس شخص کی اپنی روح سے وابستگی کس حد تک ہے۔ اس کے اوپر دنیا کا غلبہ ہے یا اسے استغنیٰ حاصل ہے۔ روحانی استاد وہ جس کی قربت میں آدمی کا ذہن ماورائی دنیا کی طرف متوجہ ہوجائے اور جتنی دیر آدمی اس کے پاس بیٹھے اس کے اوپر غم، خوف، اضمحلال اور پریشانی کا سایہ نہ پڑے۔ یقین کے بجھتے دیئے روشن ہوجائیں۔ روحانی استاد کی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی سے توقع رکھتا ہے اور نہ اس کے اندر

حسد اور لالچ ہوتا ہے۔ روحانی استاد کی مجلس میں بیٹھ کر دماغ بڑا محسوس ہوتا ہے۔ ذہن کائناتی نظام میں اس طرح گم ہوجاتا ہے کہ دماغ میں تفکر کا Pattern متحرک ہوجاتا ہے۔ اس کے اوپر غیبی دنیا کے علوم وارد ہونے لگتے ہیں۔

انسان کے اندر دن اور رات میں جو تقاضے کام کرتے ہیں ان کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہے اور ان گیارہ ہزار کیفیات پر ایک اسم ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

کائنات میں ہر ذی روح کے اندر دو حواس کام کرتے ہیں۔

1۔ وہ حواس جو غیب سے قریب کرتے ہیں۔

2۔ وہ حواس جو بندے اور غیب کے درمیان دیوار بن جاتے ہیں۔

قانون یہ ہے کہ مادی مظاہر میں انسان زمان و مکان میں قید ہے اور غیب کی دنیا میں زمانیت اور مکانیت انسان کے ارادے کے تحت عمل کرتی ہے۔

یہ ساری کائنات روشنی کے ہیولیٰ میں سفر کررہی ہے۔ جس روشنی کے ذریعے ہماری آنکھ دیکھتی ہے اس روشنی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کے حواس میں ثقل اور ابعاد دونوں شامل ہیں لیکن دوسری سطح میں صرف ابعاد ہیں۔ روشنی ہمیں جو اوپری سطح کی اطلاع دیتی ہے حواس انہیں براہ راست دیکھتے اور سنتے ہیں۔ جو اطلاعات ہمیں نچلی سطح سے پہنچتی ہیں ان کی وصولی کے راستے

میں کوئی مزاحمت ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حواس ان اطلاعات کی پوری گرفت نہیں کرتے۔ جو اطلاعات ہمیں اوپری سطح سے موصول ہوتی ہیں یہی اطلاعات نچلی سطح سے موصول ہونے والی اطلاعات کے راستے میں مزاحمت بن جاتی ہیں۔ گویا کہ ایک طرح کی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے، یہ دیوار اتنی سخت ہوتی ہے کہ ہمارے حواس کوشش کے باوجود اسے پار نہیں کرسکتے۔ اوپری سطح کی اطلاعات دو قسم کی ہیں۔

1۔ وہ اطلاعات جو اغراض پر مبنی ہوں، ان کے ساتھ ہمارا رویہ جانبدارانہ ہوتا ہے۔

2۔ وہ اطلاعات جو انفرادی مفاد سے وابستہ نہیں ہوتیں ان کے حق میں ہمارا رویہ غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔

اطلاعات کی ان دونوں طرزوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ انسان کے پاس ادراک کے دو زاویئے ہیں۔ ایک وہ زاویہ جو انفرادیت تک محدود ہے۔ دوسرا وہ زاویہ جو انفرادیت کی حدود سے باہر ہے۔ جب ہم انفرادیت کے اندر دیکھتے ہیں تو کائنات شریک نہیں ہوتی اور جب انفرادیت سے باہر دیکھتے ہیں تو کائنات شریک ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آدمی طبعیات کے فرضی دائروں میں خود کو گم کردیتا ہے۔ کوئی ذی ہوش آدمی جب ان فرضی دائروں کا تجزیہ کرتا ہے تو وہ

ایک روشن راستے پر گامزن ہوجاتا ہے۔ اس روشن راستہ پر چلنے والا مسافر کائناتی تفکر کی رہنمائی میں ایک منزل کا تعین کرتا ہے اور اس منزل پر پہنچنے کے لئے علم مابعد النفسیات اس کے لئے مشعل بن جاتا ہے۔

کائناتی برادری کا ایک فرد (آدم زاد) جب طبعیات کے دائروں میں خود کو قید کرلیتا ہے تو کائناتی سسٹم میں خلاء واقع ہونے لگتا ہے اور یہ خلاء ادبار بن کر آدم زاد برادری کو سکون سے محروم کردیتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب کسی ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے، جو اطلاعات کے اصل علم سے واقف ہو یہی آزاد ذہن شخص اپنے شاگردوں کو ذاتی اغراض سے نکال کر ماورائی علوم کے راستے پر گامزن کردیتا ہے۔ جیسے جیسے اس راستہ پر قدم آگے اٹھتے ہیں شاگرد کی طرز فکر آزاد ہوجاتی ہے۔ یہ آزاد طرز فکر شعوری دنیا کو لاشعوری دائرے میں داخل کردیتی ہے۔

ہر انسان کے اندر بیک وقت دو دنیائیں آباد ہیں، ایک شعوری دنیا اور دوسری لاشعوری دنیا۔ شعوری دنیا محدود ہے اور لاشعوری دنیا لامحدود ہے۔ لامحدود دنیا میں لاکھوں کہکشائیں اور کہکشاؤں میں کروڑوں دنیائیں آباد ہیں۔ ماہرین اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ہر دنیا میں آدم زاد برادری موجود ہے۔ زمانیت کی درجہ بندی کی وجہ سے اس انسانی برادری کے خدوخال میں تو کوئی

تبدیلی واقع نہیں ہوتی البتہ تخلیقی فارمولے میں یہ فرق ہوجاتا ہے کہ کسی دنیا کی مخلوق Transparent ہے، کسی دنیا کی مخلوق سنہری ہے اور کسی دنیا کی مخلوق Mercury ہے۔ لیکن ہر دنیا میں دوسری مخلوقات کے علاوہ آدم زاد یا انسان یقینی طور پر موجود ہے۔

روشنی کیا ہے

کہا جاتا ہے کہ زمین سے قوس و قزح کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یعنی ہماری نظر میں اتنی وسعت ہے کہ ہم نو کروڑ میل دور دیکھ سکتے ہیں۔

مارچ 1978ء میں شائع شدہ کتاب "رنگ اور روشنی سے علاج" میں درج ہے کہ رنگ و نور کی جو کرنیں سورج سے ہم تک منتقل ہوتی رہتی ہیں ان کا چھوٹے سے چھوٹا جزو Photon کہلاتا ہے۔ فوٹون کا ایک وصف یہ ہے کہ اس میں اسپیس نہیں ہوتا۔ اس میں لمبائی، چوڑائی، موٹائی نہیں ہے۔ اسلئے جب یہ کرنوں کی شکل میں پھیلتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں نہ ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ باالفاظ دیگر یہ جگہ نہیں روکتے۔ اس وقت تک جبتک دوسرے رنگ سے نہ ٹکرائیں۔

آپ کیا سمجھے روشنی اور رنگ (مکانیت) کیا ہے ؟

فضاء میں جس قدر عناصر موجود ہیں ان میں سے کسی عنصر سے فوٹان کا ٹکراؤ ہی اسے مکانیت بناتا ہے۔

ہمیں یہ تو علم ہے کہ ہمارے کہکشانی نظام میں بہت سے سورج ہیں۔ وہ کہیں نہ کہیں سے روشنی لاتے ہیں۔ انکا درمیانی

فاصلہ کم سے کم پانچ نوری سال بتایا جاتا ہے۔ جہاں ان کی روشنیاں ٹکراتی ہیں۔ وہ روشنیاں مقداروں اور قسموں پر مشتمل ہیں۔ وہ روشنیاں چونکہ قسموں اور مقداروں پر مشتمل ہیں اسلئے حلقے بنادیتی ہیں۔ جیسے ہماری زمین اور سیارے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج سے یا کسی اور Star سے جس کی تعداد ہمارے کہکشانی نظام میں دو کھرب بتائی جاتی ہے۔ ان کی روشنیاں اربوں، کھربوں، سنکھوں پر مشتمل ہیں۔ جہاں ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے وہیں ایک حلقہ بن جاتا ہے جسے سیارہ کہتے ہیں۔

اسپیس کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کو Electron کہتے ہیں۔ جہاں الیکٹران اور فوٹان دونوں ٹکراتے ہیں وہیں سے نگاہ رنگ یا روشنی دیکھنا شروع کردیتی ہے۔ رنگ جب روشنی میں مظہر بنا تو طبعیات کا فلسفہ وجود میں آیا۔ طبعیات میں دلچسپی لینے والوں نے اکثر نظریہ اضافیت کے بارے میں پڑھا ہوگا اور سنا ہوگا۔ عام طور پر اس کو مشکل نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کو سمجھنے میں جو مشکل درپیش ہوتی ہے وہ نظریہ اضافیت کی وسعت ہے۔ نظریہ اضافیت کا خلاصہ یہ ہے۔

1۔ کائنات میں وقت اور فاصلے کی مطلق کوئی حیثیت نہیں ہے۔

2۔ کائنات لامحدود نہیں ہے۔

3۔ کائنات ٹیڑھی ہے، جس طرح زمین ٹیڑھی ہے۔

4۔ سورج کی شعائیں جس وقت کسی سیارے کے پاس سے گذرتی ہیں تو کشش ثقل کے باعث ٹیڑھی ہوکر اس سیارے کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔

طالبعلم جب طبعیاتی نظریہ اضافیت سے گذر کر نظریہ رنگ و نور کی اضافیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہاں اسے اربوں کھربوں دنیاوں پر مشتمل کائناتیں نظر آتی ہیں۔ عظیم روحانی سائنسدان قلندر بابا اولیاءؒ اپنی کتاب "لوح و قلم" میں لکھتے ہیں کہ :

"کائنات کی دو سطحیں ہیں۔ اگر ہم ایک سطح کو کل ذات کہیں تو دوسری سطح کو یک ذات کہیں گے۔ کل ذات چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ذرات (چاند، سورج، مریخ وغیرہ) کا بسط (Base Line) ہے یعنی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بڑے سے بڑا کرہ جن روشنیوں کا مجموعہ ہے، وہ ساری روشنیاں کل ذات کے اجزاء ہیں۔ اگر ہم ان روشنیوں کو دیکھ سکیں تو یہ تصورات کی صورت میں نظر آئیں گی۔ یہی تصورات کل ذات Internal Self سے یک ذات Personal Ego میں منتقل ہوتے ہیں۔ ان کا منتقل ہونا کل ذات پر منحصر ہے۔ کل ذات جن تصورات کو یک ذات کے سپرد کردے، یک ذات انہیں قبول کرنے پر

مجبور ہے۔ گلاب کو کل ذات سے وہی تصورات منتقل ہوتے ہیں جو گلاب کی شکل و صورت میں تخلیق پاتے ہیں اس طرح انسان کو بھی کل ذات سے وہی تصورات منتقل ہوتے ہیں جو انسانی شکل و صورت کا مظہر ہیں۔ کل ذات انسان کا لاشعور ہے اور لاشعور ہی خود اپنے جسم کی تخلیق کرتا ہے۔ عام زبان میں جس کو Matter کہا جاتا ہے، وہ لاشعور کی مشین کا بناہوا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ خارج سے جو غذا انسان کو ملتی ہے اس سے خون اور جسم بنتا ہے۔ یہ قیاس غلط ہے۔ دراصل انسان کا لاشعور تصورات کو روشنی سے مادے کی صورت میں بدل ڈالتا ہے۔ یہی مادہ جسمانی خدو خال اور شکل و صورت میں متعارف ہوتا ہے۔ جب لاشعور (کل ذات) کسی وجہ سے تصورات کو مادے میں منتقل کرنے کا اہتمام نہیں کرتا تو موت واقع ہو جاتی ہے۔"

یک ذات اور کل ذات کے درمیان روشنی ایک پردہ ہے اس روشنی کے ذریعے کل ذات کے تصورات یک ذات کو وصول ہوتے ہیں۔ کل ذات جو اطلاعات یک ذات کو دیتی ہے ان اطلاعات کو روشنی رنگ و روپ اور ابعاد دے کر یک ذات تک پہنچاتی ہے۔

زمان و مکان دو چیزیں نہیں ہیں۔ روشنی سے ملنے والی

اطلاعات کی جو سطح نظر سے اوجھل ہے اس کا نام زمان Time ہے اور جو سطح نظر کے سامنے ہے اس کا نام مکان Space ہے۔

اگرچہ کائنات کی بناوٹ بہت زیادہ پیچیدہ نہیں مگر فکر انسانی نامانوس ہونے کی وجہ سے اس کو پیچیدہ سمجھتی ہے۔

لاتناہیت کے عالم سے تمام کہکشانی نظاموں کو ادراک تقسیم ہوتا ہے۔ یہ ادراک لاشمار لمحات سے گذرتا ہے۔ یہی لمحات کہکشانی نظاموں کی شکل و صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ جب ہم نظریہ اضافیت میں زمانیت اور مکانیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو دراصل ان ہی لمحات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ لمحہ کیا ہے؟ یہ لمحہ ایک نقطہ ہے اور اس نقطہ میں ہی ساری کائنات بند ہے۔ نقطہ کا کھلنا یا نقطہ کی حرکت ادراک ہے۔ ادراک ہی ہمیں زمانیت اور مکانیت سے آزاد کردیتا ہے اور ادراک ہی مکانیت اور زمانیت میں بند کرتا ہے۔ کائنات کے ادراک میں حرکت ہوتی ہے۔ خود لاتناہیت میں حرکت نہیں ہوتی یہ حرکت ایک یونٹ ہے۔ اس یونٹ کی دو سطحیں ہیں ایک کا نام زمان ہے اور دوسری کا نام مکان ہے۔ زمان کائنات کی Base اور مکان کائنات کے خدو خال ہیں۔

جو قومیں نظام کائنات میں تفکر کرتی ہیں ان کے اوپر ترقی کی

راہیں کھل جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس اس قدر ترقی کرچکی ہے کہ اگر ترقی پذیر قوم سائنسدانوں کی صف میں شامل ہوکر سائنسی ایجادات کرنا چاہے تو سائنس دان سینکڑوں سال اور آگے بڑھ جائیں گے۔

زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے من حیث القوم ترقی پذیر اقوام کو انبیاء کی طرز فکر کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

تمام آسمانی کتابوں میں کائنات سے متعلق سائنسی علوم موجود ہیں۔ اگر ہم الہامی کتابوں پر تفکر کریں تو بہت کم عرصہ میں موجودہ سائنس دانوں پر سبقت حاصل کرسکتے ہیں۔ اس وقت سائنس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ زماں کی نفی کرکے زیادہ سے زیادہ رفتار پر کنٹرول حاصل کرلیا جائے۔ الہامی کتابوں میں زمان کی نفی Timelessness کا فارمولا موجود ہے۔ تفکر کے ساتھ جب ہم آخری الہامی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ساری کائنات روشنی ہے۔ موجودہ دور کا سائنسدان اس مقام تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے معلوم کرلیا ہے کہ زمین پر ہر چیز روشنی کے غلاف میں بند ہے۔ انسان کے اوپر بھی روشنی کا ایک غلاف ہے جس کو سائنسی اصطلاح میں Aura کہا جارہا ہے۔ Kirlian Photography کے ذریعے سائنسدان اورا

کے Shadow کا فوٹو لینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اگر ترقی پذیر اقوام آخری الہامی کتاب میں ملکہ صبا کے قصہ پر غور کریں اور علم الکتاب سیکھ لیں تو زمان و مکان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے پر قدرت حاصل کرسکتی ہیں۔

قانون

کائنات کو دو طرزوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک صرف دیکھنا اور دوسرے مرحلے میں یہ بات معلوم کرنا کہ کائنات کن فارمولوں سے مرکب ہے۔ کائنات کو دیکھنا یا مظاہر کو دیکھنا شعوری دائرہ کار میں آتا ہے۔ کائنات کے باطن کو دیکھنا لاشعور میں دیکھنا ہے۔ انسان کا لاشعور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کائنات کے ہر ذرے کی شکل و صورت حرکات اور باطنی حسیات کیا ہیں۔ شعور میں یہ علم اس لئے نہیں آتا کہ انسان کو اپنے لاشعور کا مطالعہ کرنا نہیں آتا۔ اگر ہمارے اندر لاشعور کو مطالعہ کرنے کی صلاحیتیں بیدار ہوجائیں تو کائنات کے ہر ذرہ کی شکل و صورت حرکات اور باطنی حسیات کا مُطالعہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

ازل سے ابد تک جو کچھ جس طرح اور جس ترتیب کے ساتھ وقوع میں آنا تھا وقوع میں آگیا۔ یہ بات آخری الہامی کتاب قرآن میں بالوضاحت بیان ہوئی ہے کہ ماورائی ہستی اللہ نے "کن" کہا تو ازل سے ابد تک جو کچھ جس ترتیب کے ساتھ وقوع میں آنا تھا وہ ظاہر ہوگیا۔ خالق کے ذہن میں کائنات سے متعلق جو پروگرام تھا اس پروگرام سے متعلق جو فارمولے تھے، جو اجزائے

ترکیبی تھے، ان اجزائے ترکیبی میں ماضی، حال اور مستقبل جس طرح بھی موجود تھا "کن" کہتے ہی سب وجود میں آگیا۔ کن کہنے کے بعد کسی زمانے میں بھی لاکھوں سال پہلے یا لاکھوں سال بعد جو چیز بھی مظاہرے میں آئے گی وہ اس کا مظہر ہوگی جو کن کے بعد مظہر ہوچکا ہے۔ کھربوں دنیاؤں میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو پہلے سے اپنا وجود نہ رکھتی ہو۔

کسی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے انسان کا غیر جانبدار ہونا ضروری ہے۔ اگر غیر جانبدار ذہن نہیں ہوگا تو معنی پہنانے میں مصلحتین شامل ہوجائیں گی۔ ہر شخص کو طرز فکر کے دو زاویے حاصل ہیں۔ ایک زاویہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے الگ ہوکر سوچتا ہے اور دوسرا زاویہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو سامنے رکھ کر غور و فکر کرتا ہے جو بندہ اپنی ذات کو سامنے رکھ کر تجسس کرتا ہے اس کے اوپر حقائق منکشف نہیں ہوتے اور جو بندہ غیر جانبدار ہوکر گہرے تفکر کے ساتھ غور و فکر کرتا ہے اس کے اوپر حقائق منکشف ہوجاتے ہیں۔

حس

مشاہداتی بات یہ ہے کہ گوشت پوست کا لوتھڑا جب انسانی شکل و صورت اختیار کرلیتا ہے اور اس کے اندر آنکھ کان، ناک اور دماغ بن جاتا ہے تو وہ سنتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے اور محسوس بھی کرتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد ایک ضابطہ اور ایک قانون کے ساتھ اسکی نشوونما ہوتی ہے اور یہ نشوونما اسے اس مقام پر پہنچادیتی ہے جہاں فرد کو باشعور اور باعقل کہا جاتا ہے۔

نوع انسانی کا تجربہ ہے کہ دنیا میں ہر فرد اپنا الگ ادراک رکھتا ہے۔ یہ انفرادی ادراک ہی ایک دوسرے کی شناخت اور پہچان کا ذریعہ ہے۔

پہچاننے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو دیکھتے ہیں۔ پہلے خود کو جسمانی خدو خال کے ساتھ فہم و ادراک کے ساتھ پہچانتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے سامنے دوسرے شخص یا دوسرے مخلوق کو پہچانتے ہیں۔ یہ جاننا ظاہری دنیا میں جاننا ہے۔ دوسری طرز یا باطن میں پہچاننا اس طرح ہے کہ باطنی رخ میں اللہ کے حکم کی تمام تصویریں محفوظ ہیں۔

جب کوئی شکل و صورت ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم اسے باطنی وجود کی معرفت پہچان لیتے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ ہر ظاہری رخ باطن کا عکس ہے۔ جب تک کوئی شئے باطنی رخ کے ساتھ موجود نہیں ہوتی ظاہری شکل و صورت میں نظر نہیں آتی۔

افراد کائنات کی شناخت کا قانون یہ ہے کہ پوری کائنات یکجائی طور پر لوح محفوظ پر نقش ہے اور لوح محفوظ پر یکجائی پروگرام نقش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا ہر فرد دوسرے فرد سے باطنی شناخت کا ادراک رکھتا ہے۔

ہر انسان اپنے ذہن کو آئینہ تصور کرے تو دیکھنے کی براہ راست طرز یہ ہوگی کہ کوئی بھی صورت یا شئے پہلے ہمارے ذہن نے دیکھی۔ پھر ہم نے دیکھا۔ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ کوئی خیال، کوئی تصور، کوئی شئے اس وقت تک نگاہ کے لئے قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کی تصویر انسانی ذہن کی اسکرین پر پہلے سے منعکس نہ ہو۔

ہمارے سامنے ایک گلاس رکھا ہوا ہے۔ اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ نظریہ رنگ و نور کی طرزوں میں یہ دیکھنا Fiction اور غیر حقیقی ہے۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ذہن کی اسکرین پر نگاہ اور علم کے ذریعے گلاس کا عکس اور پانی کی ماہیت جیسے ہی منتقل ہوتی ہے آنکھ اس نقش کو محفوظ کرلیتی ہے۔

نظریہ رنگ و نور کے نقطہ نظر سے باہر دیکھنا، دیکھنا نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنی روح کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے باوجودیکہ اس کی آنکھ کا ڈیلا، آنکھ کی پتلی، آنکھ کا تل سب کچھ موجود ہے لیکن اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ کیوں نظر نہیں آتا؟ اس لئے نظر نہیں آتا کہ جو چیز عکس قبول کررہی تھی اس نے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا ہے۔ یہ صورت حال موت کے علاوہ عام زندگی میں بھی پیش آتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی اندھا ہوگیا اس کے سامنے بہت ساری چیزیں رکھی ہوئی ہیں لیکن اسے کچھ نظر نہیں آرہا اس لئے نظر نہیں آرہا کہ جو چیز دیکھنے کا ذریعے تھی وہ موجود نہیں ہے یعنی آنکھ نے دیکھ کر کسی چیز کا عکس ذہن پر منتقل نہیں کیا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں صحیح ہیں۔ جسمانی حیثیت بھی برقرار ہے لیکن دماغ کے Cells بیکار ہوجاتے ہیں۔ وہ سیل جو انسان کے اندر حسیات پیدا کرتے ہیں یا وہ سیل جو دیکھنے کا ذریعہ بن کر تصویری خد و خال کو ظاہر کرتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں یا معطل ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کرسکتا ہے۔ ایک آدمی کو چیونٹی کاٹتی ہے اس نے چیونٹی کو دیکھا نہیں لیکن وہ چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ وہ حس جو آدمی کے اندر کسی بھی طریقے سے علم بنتی

ہے اس نے انسانی لاشعور کو یہ بتادیا ہے کہ کسی چیز نے کاٹا ہے۔
انسان کو سب سے پہلے جس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے خواہ وہ لمس کے ذریعے ہو، شامہ کے ذریعے ہو، سماعت کے ذریعے ہو یا بصارت کے ذریعے ہو، دراصل احساس کا پہلا درجہ ہوتا ہے۔

کسی چیز کو سننا، سننے کے بعد مفہوم اخذ کرنا یہ احساس کی دوسری درجہ بندی ہے۔ انسان کو جب کسی چیز کا پہلی مرتبہ علم حاصل ہوتا ہے تو یہ احساس کا پہلا درجہ ہے۔ دیکھنا احساس کا دوسرا درجہ ہے، سننا احساس کا تیسرا درجہ ہے، چیز کو سونگھ کر اسکی خوشبو یا بدبو کو محسوس کرنا احساس کا چوتھا درجہ ہے، چھونا احساس کا پانچواں درجہ ہے۔ امر حقیقت یہ ہے کہ انسان فی الواقع ایک علم ہے اور علم مختلف درجوں میں احساس بنتا ہے۔

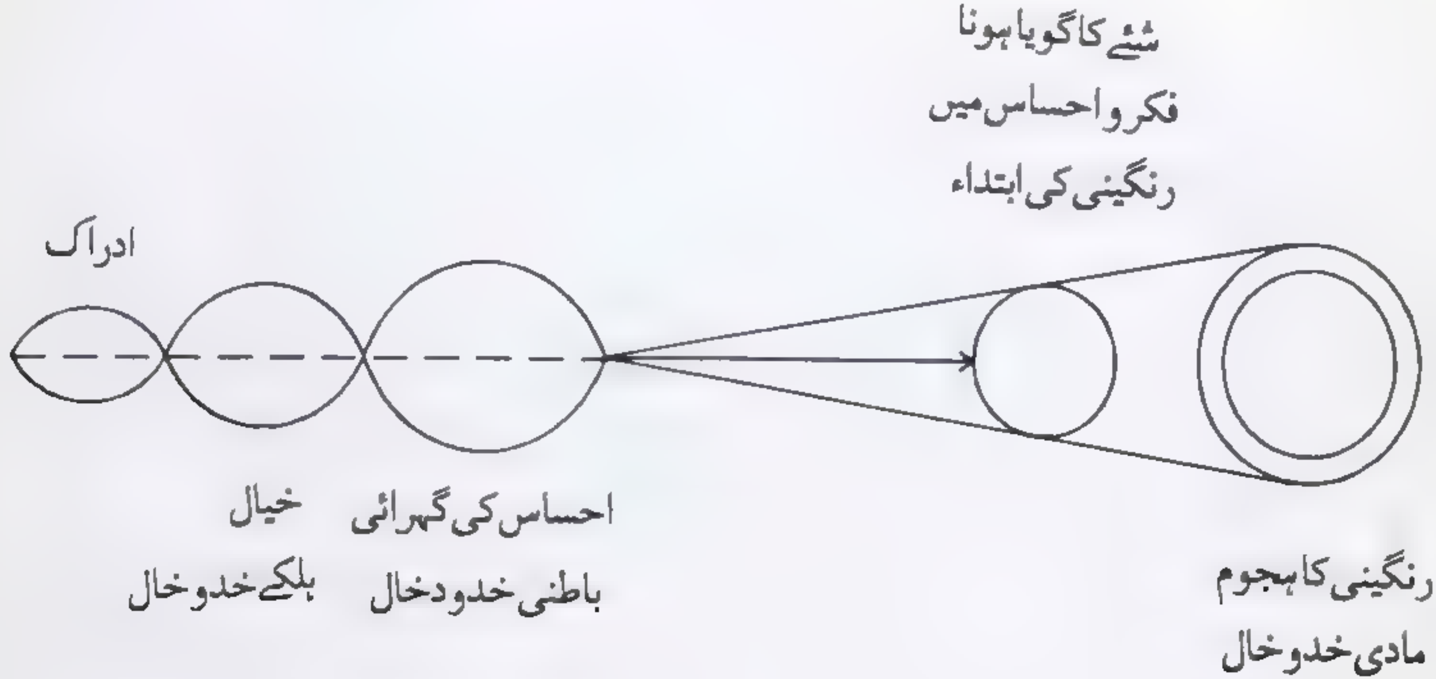
وحدت الوجود وحدت الشہود

جب نگاہ بالواسطہ دیکھتی ہے تو خود کو مکانیت اور زمانیت کے اندر مقید محسوس کرتی ہے اور جیسے جیسے بالواسطہ دیکھنے کی طرزیں گہری ہوتی جاتی ہیں اسی مناسبت سے کثرت در کثرت درجے تخلیق ہوتے چلے جاتے ہیں۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود یا وحدت کی اصطلاحات، انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ انسان اپنی محدود فہم کے مطابق یا اپنی محدود فکری صلاحیت کے مطابق جو کچھ بیان کرتا ہے وہ انسان کی اپنی فکر کے اندر محدود ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ وحدت الوجود وحدت باری تعالیٰ ہے ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اس لئے اللہ کی وحدت کو یا اللہ کے کسی وصف کو انسانی شعور بیان کرنے سے قطعی کوتاہ اور قاصر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی لفظ کے ذریعہ اللہ کی صفات کا مکمل اظہار ہوسکے۔

انسان کی محدود فکر کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات جس حد تک سمائیں اس نے اس کو لامحدودیت کا نام دے دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا جب ہم اللہ کی وحدت کا تذکرہ کرتے ہیں تو فی الحقیقت اپنی وحدت کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی ہم یہ کہنا چاہتے ہیں

علم کے نزول سے مظاہر کا وجود



کہ ہم نے اللہ کی صفات کو اس حد تک سمجھا ہے۔

اللہ کا علم جب نزول کرتا ہے تو اس نزول کی پہلی حالت کا نام ادراک ہے۔ اللہ کا یہ علم جب ادراک بن کر ایک نکتہ پر کچھ دیر قیام کرتا ہے اور اس کے اندر گہرائی پیدا ہوتی ہے تو نگاہ بن جاتی ہے۔ ادراک میں جب تک گہرائی پیدا نہیں ہوتی، خیال کی کیفیت وارد نہیں ہوتی۔ ادراک اگر گہرا ہے اور خیال کی صورت میں موجود ہے تو کوئی چیز یا کوئی صورت سامنے نہیں آتی صرف احساس ہوتا ہے۔ یعنی ادراک جب خیال کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو کسی چیز کا ہلکا سا عکس پڑتا ہے اور جس چیز کا عکس پڑتا ہے اس چیز کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ خیال کی حدود میں احساس تو کام کرتا ہے لیکن اسکی حیثیت صرف فکر کی ہوتی ہے۔ جب احساس ایک ہی نقطہ پر چند لمحوں کے لئے مرکوز ہوجاتا ہے تو اس نقطہ میں خد و خال اور شکل و صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ خدو خال اور شکل و صورت اندرونی نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ نگاہ کے سامنے آنے والے ماورائی خدو خال یا ظاہری خدو خال جب ایک نقطہ پر چند لمحے اور مرکوز رہتے ہیں تو شئے گویا ہوجاتی ہے اور قوت گویائی اگر ذرا دیر اور اس نقطہ یا اس ایک فرد کی طرف متوجہ رہے تو فکر اور احساس میں رنگینی پیدا ہوجاتی ہے اور نقطہ اپنے ارد گرد نیرنگی کا ایک ہجوم محسوس کرتا

ہے۔ جب اس ہجوم پر روح کی مرکزیت کچھ دیر کے لئے قائم ہوجاتی ہے تو شعور میں کشش کی روشن لہریں پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ لہریں جسے دیکھتی ہیں محسوس کرتی ہیں، انہیں چھو دیتی ہیں۔ لہروں کے اس عمل کا نام ''لمس'' ہے۔

کوئی بھی مخلوق یا آدم زاد اوپر سے نیچے سیڑھی بہ سیڑھی اتر کر پیدا ہوتا ہے اور اس کی روح اپنے اظہار اور اپنی جلوہ نمائی کے لئے گوشت پوست کا ایک جسم تخلیق کرتی ہے۔ اس کے بعد فکر انسانی تنزل یافتہ شکل سے صعود کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور ہماری حس پیدا ہونے والی حس سے یا پہلے حواس سے دور ہونے لگتی ہے۔ دوری سے مراد یہ ہے کہ پیدا ہونے والا ایک دن کا بچہ جب دوسرے دن میں داخل ہوتا تو پہلا دن زندگی کے نزول کا رد عمل ہے۔ یہی رد عمل مکانیت اور زمانیت کا احساس دلاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوا اس کی تمام صفات اس کے تمام اعضاء، اس کے تمام حواس ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہی تبدیلی دراصل زمانیت اور مکانیت کا پھیلاؤ ہے۔

بچہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس بات کو سمجھ رہا ہے یا غیر اختیاری طور پر یہ بات اس کے شعور میں ریکارڈ ہورہی ہے کہ میں ایک لمحے اس سے گذر کر دوسرے لمحے میں داخل ہوگیا ہوں۔

ایک گھنٹہ، ایک دن، ایک ماہ اور ایک سال سے دوسرے سال میں داخل ہو گیا ہوں ۔ شعوری کیفیت میں درجہ بہ درجہ سیڑھی بہ سیڑھی حواس کا سفر کرنا ہی زمانیت اور مکانیت ہے۔ پیدا ہونے والے بچے کے منٹ، گھنٹے، ہفتے، مہینے اور سال گذرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نقطہ جس کی حیثیت علم اور علیم کی ہے۔ علم نزولی سے دور ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ موت وارد ہوجاتی ہے۔ موت کے بعد روح ایک اور علم جدید سیکھتی ہے۔ جو علم مکانیت اور زمانیت میں بند ہوکر سامنے نہیں آتا۔ اس علم جدید میں انسان گوشت پوست کے جسم سے آزاد ہوجاتا ہے۔

کائنات کی ساخت پر غور کرنے سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ ساری کائنات اس میں انسان بھی شامل ہے روشنی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ روشنی مستقل تین دائروں میں اوپر نیچے گھوم رہی ہے۔ پہلے دائرے میں کائنات سے متعلق غیب کی تمام معلومات نقش ہیں اور وہ رموز ہیں جن کے تحت کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ انسان کے اندر پہلے دائرے میں وہ علم نقش ہے جو مصلحتوں اور اسرار کا علم ہے۔ ماورائی علم سیکھنے والا کوئی شاگرد جب اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کے سامنے پہلا دائرہ آجاتا ہے تو وہ تجلیات کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ جب تجلیات انسان کے مشاہدے میں آجاتی ہیں تو کائنات کے غیب سے متعلق ریکارڈ بھی اسی کی

نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

دوسرا دائرہ نور کا دائرہ ہے اس دائرے میں وہ احکامات نقش ہوتے ہیں جو علم کے بعد زندگی اور زندگی کا کردار بنتے ہیں۔

تخلیق سے متعلق تیسرا دائرہ روشنیوں کا دائرہ ہے۔ اس دائرے میں زندگی کا ہر عمل ریکارڈ ہوتا ہے۔ جہاں تک زندگی کے عمل کے ریکارڈ ہونے کا تعلق ہے یہ صرف انسان اور جنات کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کائنات میں موجود تمام مخلوق کے عمل کا ریکارڈ ہے۔ ہم جب دائروں کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ تصور ابھرتا ہے کہ دائرے کوئی الگ الگ چیز ہیں۔ پہلا، دوسرا، اور تیسرا دائرہ۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ محض سمجھنے کے لئے یا الفاظ کی کمی کی مجبوری کے باعث ہے۔ ہم دنیا میں موجود الفاظ میں ریکارڈ زندگی کی پوری تشریح نہیں کرسکتے۔ یہ تینوں دائرے تین اوراق کے دو دو صفحات کی طرح ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔

تین دائروں میں پہلا دائرہ Energy بناتا ہے۔ دوسرا دائرہ اس انرجی کو استعمال کرکے زندگی کی طرزیں متعین کرتا ہے اور تیسرا دائرہ تمام کرداروں کو یکجا کرکے مظاہر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

تحقیق اور تلاش

کسی علم کی کنہ تک پہنچنے کے لئے گہرائی تک جانا ضروری ہے۔ سطحی سوچ سے کسی علم کی کنہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی علم ایسا نہیں ہے جس میں تحقیق، تجسس، تلاش اور گہرائی موجود نہ ہو۔ جیسے جیسے ہم کسی علم کے اندر تفکر کرتے ہیں اسی مناسبت سے اس علم میں ہمیں نئے نئے نقطے نظر آتے ہیں اور جب ہم ان نکات پر اور زیادہ گہری نظر سے تفکر کرتے ہیں تو علم کی بے شمار شاخیں بن جاتی ہیں۔ جس علم کے بارے میں جتنے زیادہ لوگ تفکر کرنے والے موجود ہوتے ہیں یا کسی ایک علم کی ریسرچ میں جتنے زیادہ باہوش دماغ شامل ہوجاتے ہیں وہ علم اسی مناسبت سے ترقی کرتا رہتا ہے اور مبسوط علم بن جاتا ہے۔ ایسا علم جسکا اپنا ایک نظریہ، ایک فلسفہ اور اپنا ایک طرز استدلال ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں سائنسی علوم میں بھی یہی عمل کارفرما ہے۔ ایک سائنسدان نے علم کے کسی ایک شعبہ پر تفکر کیا اور تفکر کرتے کرتے وہ کسی مثبت نتیجے پر پہنچا اور مرگیا۔ دوسرے سائنسدان نے اس علم کو آگے بڑھایا اور نتیجے میں کچھ روشن پہلو

اور نمایاں ہوگئے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ عالی دماغ اس تحقیق میں شریک ہوتے رہے اور علم کی ایک حیثیت قائم ہوگئی۔ ایک تھیوری بن گئی۔ پھر یہ علم اور آگے بڑھا اور اس میں مزید باہمت، باذوق دماغ شریک ہوئے اور اس تھیوری کو پریکٹیکل کی صورت دیدی گئی۔ نتیجے میں ایک ایسا علم تشکیل پاگیا جس سے کوئی عقل کا اندھا بھی انکار نہیں کرسکتا۔ ہر نئے علم کو علمی حیثیت دینے اور عوام الناس سے متعارف کرنے کے لئے اس علم کی مختلف طرزوں میں، مختلف پیراؤں میں، مثالوں سے اور نئی نئی ترغیبات اور تشبیہات سے تشریح کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے یہ تشریحات دماغ کے اوپر وارد ہوتی ہیں۔ شعور ان سے آشنا ہوتا رہتا ہے۔ نتیجہ میں شعور گہرائی میں سفر کرنے لگتا ہے۔ طالب علم جب شعور کی گہرائی میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کے سامنے لاشعور کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جب کوئی روحانی مسافر، علم الٰہی کے راستے پر سفر کرتا رہتا ہے اور شعور کی گہرائی سے گزر کر لاشعور کی گہرائی میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کے اوپر ورائے لاشعور کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ورائے شعور ایسا علم ہے کہ جہاں انسان جان لیتا ہے کہ کائنات کس نے بنائی ہے، کس طرح بنی۔ کائنات کی تخلیق میں کون کون سی مصلحتیں کارفرما ہیں۔

اگر انسان کے اندر تفکر کی راہیں موجود ہوں تو تھیوری سے

گزر کر پریکٹیکل میں داخل ہونا، کائنات اور کائنات بنانے والے کو جان لینا، اس سے ہمکلام ہونا آسان عمل بن جاتا ہے۔

ناقابل تذکرہ شئے

جس ہستی نے یہ کائنات بنائی اس کا ارشاد ہے

"انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی"

یہی بات اس ہستی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہی۔

"اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے۔ میری مرضی اور میرے دیئے ہوئے علوم سے۔ پھر اس میں پھونک مارتا تو ہوجاتا جانور"

حضرت عیسیٰؑ مٹی کے جانور میں پھونک مارتے تھے تو وہ اڑ جاتا تھا۔ پیدائشی اندھے اور کوڑھی کے اوپر دم کرتے تھے وہ بھلا چنگا ہوجاتا تھا۔

یہ راز ہمارے اوپر منکشف ہوچکا ہے کہ "کن" کے بعد اجتماعی اور انفرادی طور پر تمام موجودات یکجائی طور پر تخلیق ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کہ "میں ہوں" مخلوق کو کوئی ادراک نہیں تھا۔ ایک حیرت کا عالم تھا۔ خالق کائنات نے جب اس محویت اور اس حیرت کو ختم کرنا چاہا تو موجودات کو براہ راست مخاطب کیا اور کہا :

"پہچان لو، میں تمہارا رب ہوں"

جیسے ہی روحوں کے کانوں سے خالق کی آواز ٹکرائی، سننے کے ادراک کے ساتھ متوجہ ہونے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ روحیں جب اس آواز کی طرف متوجہ ہوئیں تو نظر وجود میں آگئی اور نظر نے کائنات کے خالق کو دیکھ لیا۔ خالق کو دیکھتے ہی روحوں نے جواباً عرض کیا :

" جی ہاں ! آپ ہمارے رب ہیں۔"

اللہ تعالی نے مخلوق جو علوم منتقل کئے ہیں ان کے تین درجے ہیں۔ تینوں علوم اور اللہ کی تینوں صفات مخلوق میں ہمہ وقت، ہر آن اور ہر لمحہ جاری و ساری ہیں۔ لیکن ان صفات کا علم مکلف مخلوق کو دیا گیا ہے۔ یہ وہی علم ہے جس کو خالق کائنات نے اپنی "امانت" کہا ہے۔ جس نوع کو یہ علم حاصل ہے وہ مکلف ہے اور جس نوع کو یہ علم حاصل نہیں ہے وہ غیر مکلف ہے۔ جہاں تک شعور کا تعلق ہے کائنات میں موجود ہر شئے کو شعور حاصل ہے۔ شعور سے مراد سمجھ اور عقل ہے۔ خالق کائنات نے جہاں اپنی امانت کو دینے کا تذکرہ کیا ہے وہاں اس بات کا بھی اعلان کردیا ہے کہ کائنات میں موجود کوئی شئے، کوئی مخلوق اورکائنات کا کوئی ایک ذرہ بھی عقل و شعوری سے خالی نہیں ہے۔ خالق کائنات نے سماوات و ارض اور پہاڑوں کو اپنی

امانت پیش کی تو سب نے یہ کہہ کر اپنی بے بضاعتی اور اپنی ناتوانی کا اعتراف کیا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ انکار بجائے خود اس بات کا اقرار ہے کہ جو شئے یا جو ہستی انکار کررہی ہے اس کے اندر سمجھ اور عقل موجود ہے۔ اگر سمجھ اور عقل موجود نہ ہوتی تو انکار یا اقرار دونوں زیر بحث نہیں آتے۔ آخری کتاب قرآن میں اس امانت کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

" اور ہم نے اپنی امانت ارض و سماوات اور جبال (پہاڑوں) کو پیش کی۔ سب نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ہم یہ بار نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ہم نے آپ کی امانت اپنے کاندھوں پر اٹھائی تو ہم ریزہ ریزہ ہوجائیں گے' اور انسان نے اس امانت کو قبول کرکے اس کو حاصل کرلیا۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔"

"بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔" یہ نقطہ بہت زیادہ غورطلب ہے کہ جس امانت کے حاصل ہونے کے بعد انسان کائنات کی تمام مخلوق میں ممتاز ہوا اور اشرف المخلوقات قرار پایا اس کے بارے میں یہ کہنا "بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔" خالق کائنات نے ارض و سماوات اور جبال کو یہ نہیں کہا کہ یہ جاہل اور ظالم ہے۔ غوروفکر اس طرف نشاندھی کرتا ہے کہ سماوات زمین اور پہاڑ انسان سے زیادہ دانا، عقلمند اور باشعور ہیں۔ خالق کائنات کی دی ہوئی اس امانت یعنی اسماء کی صفات سے

واقف نہیں ہے تو اس کی حیثیت کائنات کی دوسری تمام مخلوقات سے کمتر ہے۔ جہاں آدم کو علم الاسماء عطا کرنے کا تذکرہ ہے وہاں پہلی بات یہ بتائی گئی ہے کہ علم الاسماء کا علم آدم کو اس لئے عطا کیا گیا کہ خالق آدم کو اپنا نائب بنانا چاہتا ہے۔ نائب وہ ہوتا ہے جو اپنے سر پرست کے اختیارات یا اپنے سربراہ کے اختیارات کو استعمال کرسکے۔ اختیارات کا استعمال اس وقت ممکن ہے جب اختیارات سے متعلق قوانین سے واقفیت حاصل ہو۔ تخلیقی امور کو جب ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں تو اس میں زندگی اور موت دونوں شعبے آجاتے ہیں۔ جب کسی فرد پر موت وارد ہوتی ہے تو دراصل وہ ایک Zone سے نکل کر دوسرے زون میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی جب عالم ناسوت میں مرتا ہے تو عالم اعراف میں پیدا ہوجاتا ہے۔ علیٰ ھٰذاالقیاس ازل سے ابد تک موت و زیست کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

نوٹ : خالق کائنات کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت جو بھی تخلیق وجود میں آتی ہے وہ دراصل ذیلی تخلیق ہوتی ہے۔ یعنی کوئی بھی نئی تخلیق بہرحال خالق کائنات کے بنائے ہوئے تخلیقی اجزاء یا تخلیقی صفات سے وجود میں آتی ہے۔

نظریہ رنگ و نور پر محیط شعبہ روحانیت میں ''لا'' کے مراقبہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ''لا'' کا مراقبہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات

کی نفی کردے۔ ذات کی نفی سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص انفرادی طور پر اپنے بارے میں، ماحول کے بارے میں، کائنات کے بارے میں، کائنات کی جزئیات کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اس کی نفی کردے۔

سوال یہ ہے کہ علم کی نفی کیوں کی جائے ؟

علم کی نفی اس لئے کی جائے کہ عالم ناسوت میں رہتے ہوئے ہمارا علم اور ہمارے جاننے، پہچاننے اور شناخت کرنے کی طرزیں مفروضہ اور فکشن حواس پر قائم ہیں۔ جب تک مفروضہ اور فکشن حواس کی طرزیں منفی درجہ حاصل نہیں کرلیں گی اس وقت تک غیر فکشن اور حقیقت پر مبنی حواس سے ہم واقف نہیں ہوسکتے۔ فکشن اور حقیقت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حقیقت میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ فکشن اور مفروضہ حواس ہر آن اور ہر لمحہ تغیر پذیر ہیں۔ حواس کی حیثیت فکشن ہویا حقیقی، دونوں حواس اور دونوں طرح کی طرز زندگی کا دارومدار علم کے اوپر ہے۔ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے اگر اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے اور وہاں اسکی نشوونما ہو تو اس کی تمام تر زندگی ان جانوروں کی طرح ہوگی جن جانوروں میں اس نے پرورش پائی ہے۔ اسی طرح اگر ہمیں کسی چیز کے متعلق کوئی علم نہیں ہے یا ہمارے سامنے اس کا کبھی تذکرہ نہیں ہوا ہے تو وہ چیز ہمارے لئے اور ہماری نگاہ کے

لئے معدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

گونگے، بہرے لوگوں کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ نگاہ کی حیثیت میں جس قدر معلومات ان کو فراہم ہوتی ہیں اسی مناسبت سے ان کی صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسکو محسوس کرتے ہیں لیکن اس کی تشریح نہیں کرسکتے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ گونگے، بہرے، بچے ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ ماحول سے آشنا بھی ہیں لیکن چونکہ ان کی علمی سطح محدود ہے اس لئے ان کا علم بھی محدود رہ جاتا ہے۔ قانون یہ بنا کہ نگاہ ہو، سننا ہو یا چھونا وہ سب علم کی ایک شاخ ہے اور دیکھنے، سننے، چھونے اور محسوس کرنے میں علم ہی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر کسی آدمی نے زندگی میں کبھی پتھر نہ دیکھا ہو اور اس کے علم میں لائے بغیر پتھر اس کے سامنے رکھ دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ بتائے کہ یہ کیا چیز ہے ؟ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس لئے کہ پتھر کے متعلق اس کا علم نفی کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن اگر پتھر کے بارے میں اس کو علم ہے تو اسے پتھر کو چھونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ صرف دیکھنے کے بعد ہی پتھر کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کردیگا۔ اگر پہلے سے کسی چیز کا علم نہیں ہے اس کو نہ دیکھنا ممکن ہے نہ سننا ممکن ہے اور نہ چھونا ممکن

ہے یعنی کسی چیز کے بارے میں علم ہی اس کا وجود ہے۔ یہ بات قانون بن گئی کہ ہر چیز کا وجود اس کا علم ہے تو پھر نگاہ بھی علم ہے اور سماعت بھی علم ہے۔ بات کرنا بھی علم ہے۔ چھونا بھی علم ہے اور انسانی زندگی کے تمام کردار بلاتخصیص علم ہیں۔ موجودات کی حیثیت علم کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ علم حقیقت ہے، علم ہی موجود ہے، لاعلمی لاموجود ہے۔

کائنات میں موجود تمام مخلوقات اور تمام مخلوقات کی حیات و زیست کا پروگرام سب کا سب علم ہے۔ کائنات کے بارے میں خالق کائنات نے اپنی مرضی سے ایک پروگرام بنایا ہے۔ جب اس نے پروگرام پر عمل درآمد کا ارادہ کیا اور جب اس پروگرام کو متحرک کرنا چاہا تو سوئچ آن کردیا اور پروگرام نشر ہونے لگا۔

نوع انسانی کے کسی ایک فرد کا یا تمام افراد کا بکری کے ساتھ اگر کوئی مخفی رشتہ نہ ہو تو انسان بکری کو نہیں پہچان سکتا اور بکری انسان کو نہیں پہچان سکے گی۔ ماورائی دنیا کا مسافر اس بات پر لازماً تفکر کرتا ہے کہ میں بکری کو کیوں پہچانتا ہوں اور بکری مجھے کس طرح پہچانتی ہے۔ شیر انسان کو جانتا ہے اور انسان شیر کو جانتا ہے۔ جب کوئی انسان آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو وہ برملا پکار اٹھتا ہے کہ یہ چاند ہے۔ یہ سورج ہے۔ یہ ستارہ ہے۔ صرف پکارتا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے حواس میں علمی اور

محسوساتی طور پر چاند، سورج اور ستارے کو جانتا ہے۔ کوئی آدمی جب تفکر کو اپنا شعار بنالیتا ہے تو اسکے اندر تجلی کا علم متحرک ہوجاتا ہے۔ وہ کائنات میں تمام آسمانی اجرام اور اجرام میں بسنے والے ہر ذی روح اور غیر ذی روح افراد کو ایک مخفی رشتے میں بندھا ہوا دیکھ لیتا ہے۔ روحانی مسافر کو جب مخفی رشتہ کا علم ہوجاتا ہے تو لاکھوں سال پہلے کی دنیا یا لاکھوں سال بعد کی دنیا کا ریکارڈ اس کے سامنے آجاتا ہے۔

GRAPH

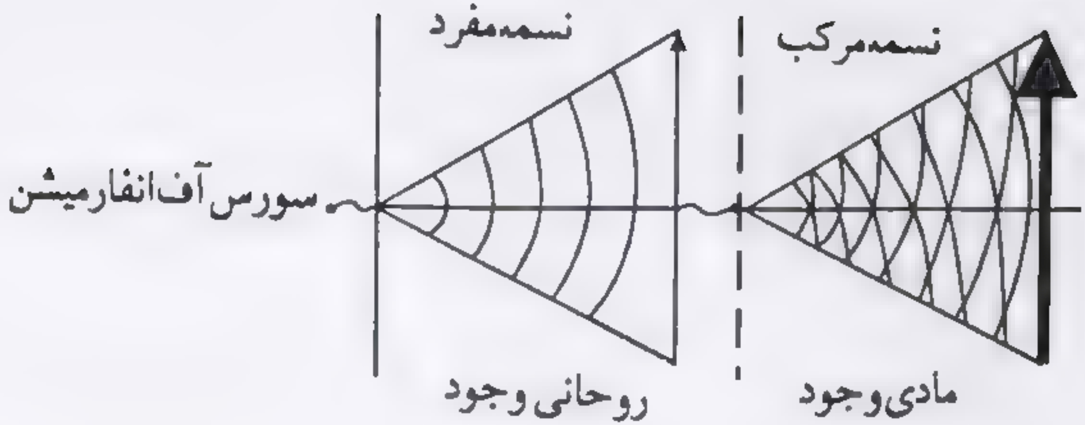
کائنات میں جتنی بھی موجودات ہیں خواہ وہ مرئی ہوں یا غیر مرئی ہوں ان میں ایک رخ ٹھوس ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک غیر مادی رخ پیوست ہوتا ہے۔ یہ رخ بھی بالکل اسی طرح ہے جس طرح گوشت پوست کا آدمی ہے۔ روشنیوں کا یہ آدمی غیر مرئی ہے اور ٹھوس آدمی مرئی ہے۔ جس طرح مرئی رخ کے دو رخ ہیں یعنی ٹھوس جسم اور دوسرا روشنیوں کا جسم اسی طرح غیر مرئی جسم کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رخ روشنیوں سے بنا ہوا جسم اور دوسرا رخ نور کا بنا ہوا جسم۔ کائنات میں جو بھی شئے موجود ہے اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ یہ دونوں رخ مل کر ہی دراصل ماہیت یا فعل بنتے ہیں۔ ان دونوں رخوں کے ملے بغیر کوئی قالب مکمل نہیں ہوتا۔

تخلیقی فارمولے کے تحت کائنات میں کوئی بھی چیز وہ غیر مرئی ہو یا مرئی ہو۔ بغیر شکل و صورت کے نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس شکل و صورت یا اس وجود کو جسمانی آنکھ نہ دیکھ سکے لیکن روح کی آنکھ اس وجود کو اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح جسمانی آنکھ کسی مادی قلب کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہے۔

مرئی اور غیر مرئی وجود کے ضمن میں یہ قانون ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ جس طرح مرئی جسم میں خدو خال ہوتے ہیں اسی طرح غیر مرئی جسم میں بھی خدو خال ہوتے ہیں۔ کسی چیز کی موجودگی پہلے ایک ہیولیٰ کی شکل میں موجود ہے اور اس کے بعد جسمانی خدو خال میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب تک شکل و صورت ہیولیٰ کے اندر موجود ہے اس وقت تک وہ اکہری لہر ہے یا غیر مرئی وجود ہے اور جب غیر مرئی وجود مادی جسم میں اپنا مظاہرہ کرتا ہے تو اس میں حرکت دہری ہوجاتی ہے اور وہ دو لہروں سے مرکب ہوجاتا ہے۔ جب تک کوئی رخ ایک سمت سے دوسری سمت میں اکہری حرکت میں جاری رہتا ہے اور اس اکہری لہر میں خدو خال ہیں تو اس حرکت سے تخلیق ہونے والی مخلوق کا نام جنات کی دنیا ہے اور جب حرکت دو لہروں پر سفر کرتی ہے اور اسمیں نقش و نگار بنتے ہیں، اس تخلیق کا نام نوع آدم ہے۔ یعنی اکہری لہر جنات کی دنیا ہے اور مرکب یا دوہری لہر انسان کی دنیا ہے۔

انسان اور انسان کی دنیا، جنات اور جنات کی دنیا اور سارا کائناتی ڈھانچہ اور سارا ماورائی نظام لہروں کے تانے بانے پر قائم ہے۔ اس کی مادی مثال ہم قالین سے دے سکتے ہیں۔ قالین کے اوپر شیر بنا ہوا ہے۔ شیر کے تمام اعضاء قالین پر اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ قالین کو دیکھ کر آدمی تانے بانے سے بنے ہوئے

حرکت کے دورخ



نسمہ، مفرد ہو یا مرکب مادی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

نسمہ مفرد سے تخلیق ہونے والا وجود بھی مادی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

نسمہ مرکب سے تخلیق ہونے والا مادی وجود جسمانی آنکھ دیکھ لیتی ہے۔

اکہری حرکت، نسمہ مفرد کہلاتی ہے۔

دوہری حرکت، نسمہ مرکب کہلاتی ہے۔

حرکت اکہری ہو یا دوہری کسی سورس آف انفارمیشن سے وابستہ ہوتی ہے۔

مادی وجود میں مظاہرہ کرنے کے لئے حرکت پہلے اکہری ہوتی ہے پھر دوہری ہو جاتی ہے۔ دوہری حرکت خدوخال کا روپ دھار کر مادیت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

نقش و نگار کو شیر کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دے سکتا۔ کائناتی نظام بھی اسی فارمولے پر قائم ہے۔

انسان کے اندر یا انسانی تخلیق میں اس طرح لہریں کام کررہی ہیں جس طرح کپڑے میں دو تار ہوتے ہیں۔ ایک تار سیدھا (طول) ہوتا ہے اور دوسرا تار (عرض) میں ہوتا ہے۔ ہر تار کو دوسرا تار چھوتا ہوا دونوں تاروں کو خانوں کی شکل میں یک جان کردیتا ہے۔ دونوں دھاگے ایک ساتھ دوسرے دھاگوں کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ ان میں کوئی فاصلہ نظر نہیں آتا لیکن ساتھ ساتھ الگ بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تانے اور بانے کے تار مل کر ایک مربع کی شکل میں خانے بناتے ہیں جس کو عرف عام میں گراف کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی دنیا طول و عرض میں روشنیوں کے تاروں یا روشنیوں کی لہروں سے بنی ہوئی ہے اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات اور حسیات انہیں تاروں کے اوپر قائم ہیں۔ دوسری بات بہت زیادہ فکر طلب یہ ہے کہ ان تاروں کی یا ان لہروں کی طوالت یعنی طویل ہونا سیدھا ہونا جس طرح معین ہے اسی طرح ہر تار کی صفات بھی معین اور مخصوص ہیں اور ہر مخصوص صفت کسی نہ کسی ساخت کو اور کسی نہ کسی نقش و نگار کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً جب ہم گراف میں انسانی چہرے کے خطوط بناتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے

ہیں کو طولانی لہروں اور عرضی لہروں پر جیسے جیسے پنسل چلتی ہے یا گراف میں بنے ہوئے خانے جس طرح پنسل کے نشان سے کٹتے ہیں اسی مناسبت سے نقش و نگار بنتے رہتے ہیں۔

گراف کے اندر جتنی لہریں موجود ہیں وہ عرضی ہوں یا طولانی نقش و نگار کی صورت میں ہر لہر اپنا ایک متعین اور مخصوص عمل رکھتی ہے۔ علی ھذا القیاس کائنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں، جتنے رنگ و روپ ہیں جتنی صلاحیتیں ہیں، جتنی نوعیں ہیں اور ہر نوع کے جتنے افراد ہیں ہر ایک کے لئے ایک مخصوص طول حرکت متعین ہے۔ انہیں حرکات کی مخصوص آمیزش کسی نوع کے فرد کی شکل و صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر لہریں مرکب ہیں یعنی لہریں تانے بانے کی شکل میں متحرک ہیں تو ان مرکب لہروں کے گراف کے اوپر نقش و نگار انسان اور انسان کی دنیا ہے۔

مفرد لہروں کے اوپر اگر تصویر کشی کی جائے یا کوئی تصویر بنی ہوئی ہے تو اس پر نقش و نگار سے بنی ہوئی دنیا جنات اور فرشتوں کی دنیا ہے۔ آخری کتاب قرآن میں ہے۔

"ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنایا تاکہ ان مصنوعات
سے خالق کائنات کی ربوبیت کو اور خالق کائنات کی
خالقیت کو سمجھ سکو۔"

حرکت محض ایک حس ہے اور اس کے بھی دو رخ ہیں۔

ایک رخ خارجی سمت میں کام کرتا ہے اور دوسرا رخ داخلی سمت میں سفر کرتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ روشنی کے تانے بانے سے بنی ہوئی ایک چادر ہے اس کے اوپر نقش و نگار کے ساتھ ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس تصویر کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ خود تصویر ہے اور دوسرا رخ وہ بساط ہے جس پر تصویر بنی ہوئی ہے۔ ایک رخ کا اپنا ذاتی احساس ہے کہ میں ہوں اور دوسرا اس بساط کا احساس ہے جس پر تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ حس کے دو رخ ہوئے ایک یہ کہ آدمی محسوس کررہا ہے کہ میں موجود ہوں، دوسرا یہ کہ آدمی یہ بھی جانتا ہے کہ میری کوئی اصل ہے۔ زمانیت اور مکانیت کا راز جاننے کے لئے ہمیں بجائے اس کے کہ ہم نیچے سے اوپر سفر کریں یا نزولی حرکات و سکنات سے صعودی حرکات و سکنات میں داخل ہوں یہ زیادہ آسان ہے کہ صعودی حرکات و سکنات سے نزولی حرکات و سکنات کو سمجھا جائے۔ نظریہ رنگ و نور کے مطابق اندر کی آنکھ دیکھتی ہے کہ عالم ارواح میں کائنات کی موجودگی اس طرح ہے کہ وہاں نہ احساس کی درجہ بندی ہے نہ نگاہ ہے اور نہ آپس میں تعارف کا کوئی ذریعہ ہے۔

کائنات کو خود آگاہی کے لئے خالق کائنات نے پہلے سماعت پھر بصارت اور پھر قوت گویائی کی حس منتقل کردی۔

اس قانون کی روشنی میں کائنات کی تخلیق کی Equation یہ

بنی کہ کائنات کی ہر چیز دو رخوں سے مرکب ہے۔ یہ دونوں رخ بظاہر ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

افراد کائنات کو جب تک ابعاد (Dimension) منتقل نہیں ہوئے تھے اس وقت تک زمان اور مکان نہیں تھے۔ عالم ارواح میں صرف شئے کا وجود ہے۔ اس کے اندر حرکت نہیں ہے۔ جب کائنات میں Dimension بن گئے یا سماعت اور بصارت کے نقوش منتقل ہوگئے تو کائنات میں حرکت پیدا ہوگئی۔ حرکت ہی سے زمان و مکان وجود میں آتے ہیں۔

باطنی علماء کہتے ہیں کہ کائنات کا پہلا شعبہ اس طرح وجود میں آیا کہ کائنات کی موجودگی میں وسائل کو کہیں دخل نہیں ہے۔ دوسرا شعبہ یہ ہے کہ عالم موجودات میں شکل و صورت، حرکت و سکون کی طرزیں نمایاں ہوئیں اور زندگی مرحلہ وار شروع ہوئی۔

انسان کائنات میں واحد فرد ہے جو بحیثیت نائب کے اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کو اور کائنات میں موجود انتظامی امور کو اپنے اختیارات سے چلاتا ہے۔ اللہ نے انسان کو کائنات کی حاکمیت عطا کردی ہے۔ حاکمیت کا وصف ہی دراصل نیابت، خلافت کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ جس طرح دنیاوی Administration میں بے شمار لوگ اپنے اپنے شعبوں کو چلاتے ہیں اسی طرح

کائنات میں بھی مختلف شعبوں کے سربراہ ہوتے ہیں ان کی سربراہی میں یہ کائناتی شعبے متحرک اور فعال ہیں۔

علمائے باطن اپنے مشاہداتی تجزیہ کی بنا پر بتاتے ہیں کہ کائنات مسلسل تخلیق پذیر ہے۔ ہر آن ہر لمحہ نئے نئے سیارے بنتے ہیں اور پرانے سیارے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ جب خالق کائنات کوئی نئی تخلیق کرنا چاہتا ہے تو اپنے نائبین سے کہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس قسم کی مخلوق اور اس قسم کے سیارے بنادیئے جائیں۔

نائبین ان موجودات کی زندگی کے اسباب اور وسائل، شکل و صورت، حرکت و سکون کی طرزیں متعین کر کے خالق کائنات کے حضور پیش کردیتے ہیں۔ ان تجاویز کو قبول کرلیا جاتا ہے۔ جب نئی تخلیق وجود میں آجاتی ہے تو انتظامی امور چلانے والے دوسرے بے شمار افراد اس نظام پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ اس پورے نظام اور اس نظام میں متعلقہ تمام شعبوں کو کائناتی ایڈمنسٹریشن کہا جاتا ہے۔

ماورائی لہر

نظریہ رنگ و نور کا شارح عرض کرتا ہے کہ کائنات اور کائنات کے اندر موجود رنگینیاں اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ آدم زاد ان سے استفادہ کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا کی لذتوں سے فرار اختیار کرکے کسی بیابان یا کسی گوشہ میں بیٹھ جائے۔ ماورائی علوم کے بارے میں ایسے سوالات ہمیشہ اٹھتے رہتے ہیں۔

خالق کائنات سے نوع انسانی اور نوع اجنّہ کا تعلق دو طریقوں پر قائم ہے ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور اس بندے کی طرز فکر میں اس کی ذات اور صفات مستحکم ہوجائیں۔ جب وہ کوئی کام کرے، ارادۃً یا غیر ارادی طور پر اس کا ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے۔ ایک طرز یہ ہے کہ انسان اللہ کی موجودگی کے بارے میں علمی طور پر یقین رکھتا ہو۔

جس کائنات کو مادی آنکھ دیکھتی اور پہچانتی ہے اس کی بنیاد روشنی ہے۔ ایسی روشنی جس کے اندر بہاؤ ہے۔ موجودہ دور کی سائنس اس کو Gases کے نام سے جانتی ہے۔ روشنیوں کے بہاؤ سے مراد یہ ہے کہ صدہا Gases کے اجتماع سے شکلیں وجود

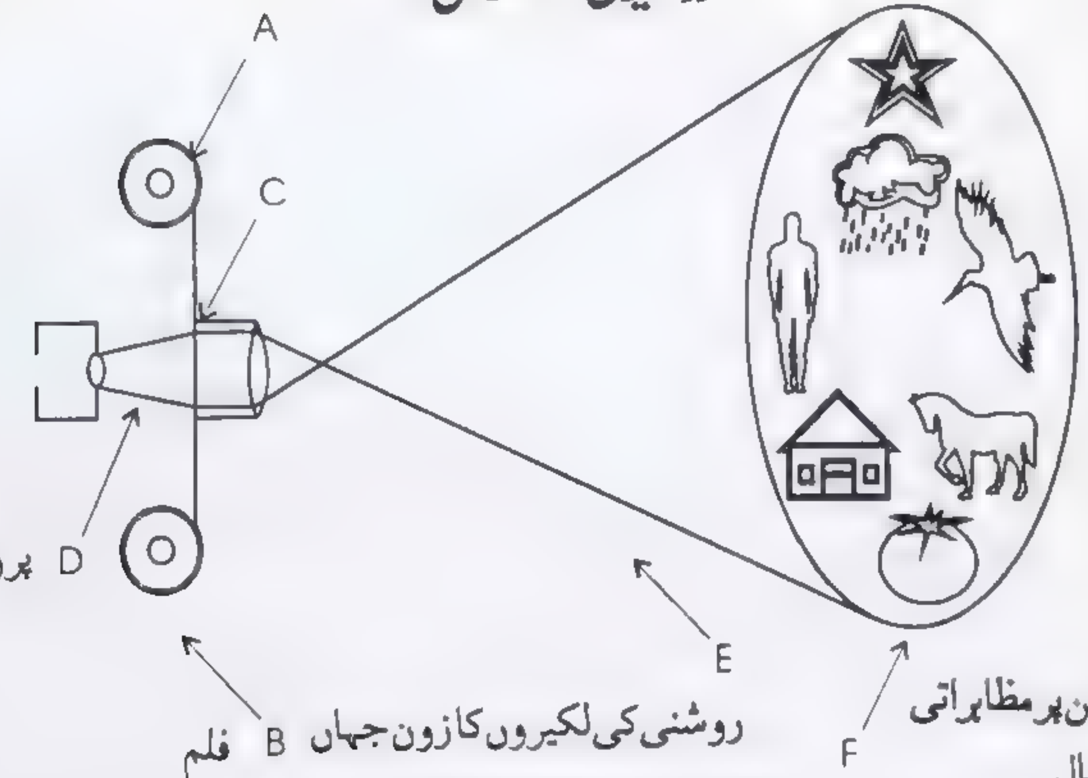
میں آتی رہتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک گلاس پانی بھر کر دیوار پر زور سے پھینکا جائے۔ پانی بہنے کے بعد جب دیوار پر پوری طرح پھیل جائے تو غور سے دیکھنے سے دیوار کے اوپر مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ جس طرح پانی دیوار کے اوپر مختلف شبیہیں بنا لیتا ہے اسی طرح نزول کرنے والی روشنیوں کا بہاؤ جب زمین (کائنات کی ایک اسکرین) پر نزول کرتا ہے تو روشنیاں پھیلنے اور بکھرنے سے افراد کائنات کی شکلیں بن جاتی ہیں۔ بہاؤ یا زمین کی اسکرین سے ٹکرانے کے بعد شبیہ کے اندر جو بنیادی مصالحہ بنتا ہے۔ وہ مرکری Mercury ہوتا ہے۔ روشنیوں کے بہاؤ کے بعد پارے کی روشنیوں سے مل کر اور ایک دوسرے کے اندر سے جذب ہوکر اجسام بنتے ہیں۔ انہی اجسام کو حیوانات، نباتات اور جمادات کہا جاتا ہے۔ گیسوں میں جو ابتدائی گیس نکلتی ہے اس گیس کی ابتدائی شکل کا نام جسم مثالی ہے۔ جسم مثالی ان بنیادی لہروں یا ان بنیادی شعاعوں کا نام ہے جو وجود کی ابتداء کرتی ہیں۔ نزول کرنے والی لہروں کو لکیروں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

مثال :

جس آدمی نے بھی سنیما میں فلم دیکھی ہے وہ یہ جانتا ہے پروجیکٹر سے ایک مخصوص روشندان کے ذریعے لہروں کا بہاؤ ہوتا

ہے۔ روشنیوں اور لہروں کا یہ بہاؤ اسکرین پر نزول کرتا ہے اور اسکرین سے ٹکرا کر مختلف شکلوں اور صورتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب ہم گردن اٹھا کر پروجیکٹر سے نکلنے والی فلمی روشنیوں یا شعاعوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں مسلسل اور متواتر چلتی ہوئی لہروں یا لکیروں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ لکیریں نہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتی ہیں اور نہ ایک دوسرے میں پیوست ہوتی ہیں۔ ہر لکیر اپنی جگہ تصویر کا کوئی نہ کوئی خدو خال ہوتی ہے۔ جس طرح پروجیکٹر سے نکلنے والی روشنی اسکرین سے ٹکرا کر تصویریں بنتی ہیں اسی طرح خلا میں سے گذر کر لہریں یا لطیف لکیریں مادی اجسام بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماورائی لکیریں مادی اجسام میں ایک بنیادی واسطہ ہیں۔ پروجیکٹر سے نکلنے والی شعاعوں کو مادی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ ماورائی لکیروں کو صرف شہود کی وہ آنکھ دیکھ سکتی ہے جو روحوں کی نگاہ ہے۔ ایسی کوئی بھی ایجاد ابھی تک وجود میں نہیں آئی کہ جس کے ذریعے ماورائی لہروں کو دیکھا جاسکے۔ البتہ ان لکیروں کے تاثرات کو سائنسی ایجادات کے ذریعے مادیت کے مظہر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آج کل ماورائی لہروں پر بہت کام ہورہا ہے۔ ماورائی لہروں کے عکس Shadow کو کیمرے کے ذریعے دیکھ لیا گیا ہے۔ یہ دیکھنا لہروں، لکیروں کی شکل میں نہیں ہے بلکہ لہروں اور لکیروں کی روشنیوں کا انعکاس ہے۔ انعکاس

روشنیوں کا انعکاس



۱۔ A مماثل ہے اخفیٰ کے۔

۲۔ B فلم، ٹیپ کا وہ حصہ جو روشنی کے سامنے سے گزرتا ہے مماثل ہے لوح محفوظ۔

۳۔ حرکت C محوری گردش کے مماثل ہے جو مکان کو تخلیق کرتی ہے۔

۴۔ E روشنی کی لکیروں کا زون جہاں تصویریں باطنی خدوخال میں موجود ہیں جو کہ مماثل ہے نسمہ کے۔

۵۔ اسکرین پر مظاہراتی خدوخال جو کہ مماثل ہے زمین کے۔

چونکہ مادیت کے مظہر کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس لئے نظر آجاتا ہے۔ جن شعاعوں یا لکیروں سے جسمانی خدو خال وجود میں آتے ہیں یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ مفرد لہریں۔ مرکّب لہریں۔ لہریں مفرد ہوں یا مرکب خلاء اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ وہ نہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے میں پیوست ہیں یہ لکیریں مفرد ہوں یا مرکب ہوں مادی اجسام میں خدو خال بھی بنتی ہیں اور خدو خال ہر دوسرے فرد پر منعکس بھی کرتی ہیں۔ ان لہروں یا ان لکیروں کے تاثرات سے ہی حسیں بنتی ہیں۔ یہ لکیریں اور لہریں انسانی دماغ کے اوپر جب نزول کرتی ہیں تو نزول کے بعد دماغ کے اوپر ہلکا سا دباؤ پڑتا ہے۔ اتنا ہلکا کہ حواس کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ یہ ہلکا سا دباؤ کسی بات سے متعلق، کسی عمل سے متعلق یا کسی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس زندگی کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل سے بھی ہوسکتا ہے اس دباؤ کا نام واہمہ ہے۔ جب یہ دباؤ ذرا زیادہ ہوتا ہے تو حواس میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور اس ہلکے ارتعاش میں ذہن کے اوپر لہروں سے بنی ہوئی تصویر کا بہت ہلکا سا خاکہ حواس کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ اس کیفیت کا نام خیال ہے۔ روشنیوں کا نزول جب گہرا ہوتا ہے تو دماغ کے اوپر نقش و نگار واضح ہوجاتے ہیں۔ کسی چیز کا خاکہ جب نمایاں ہوتا ہے تو ذہن

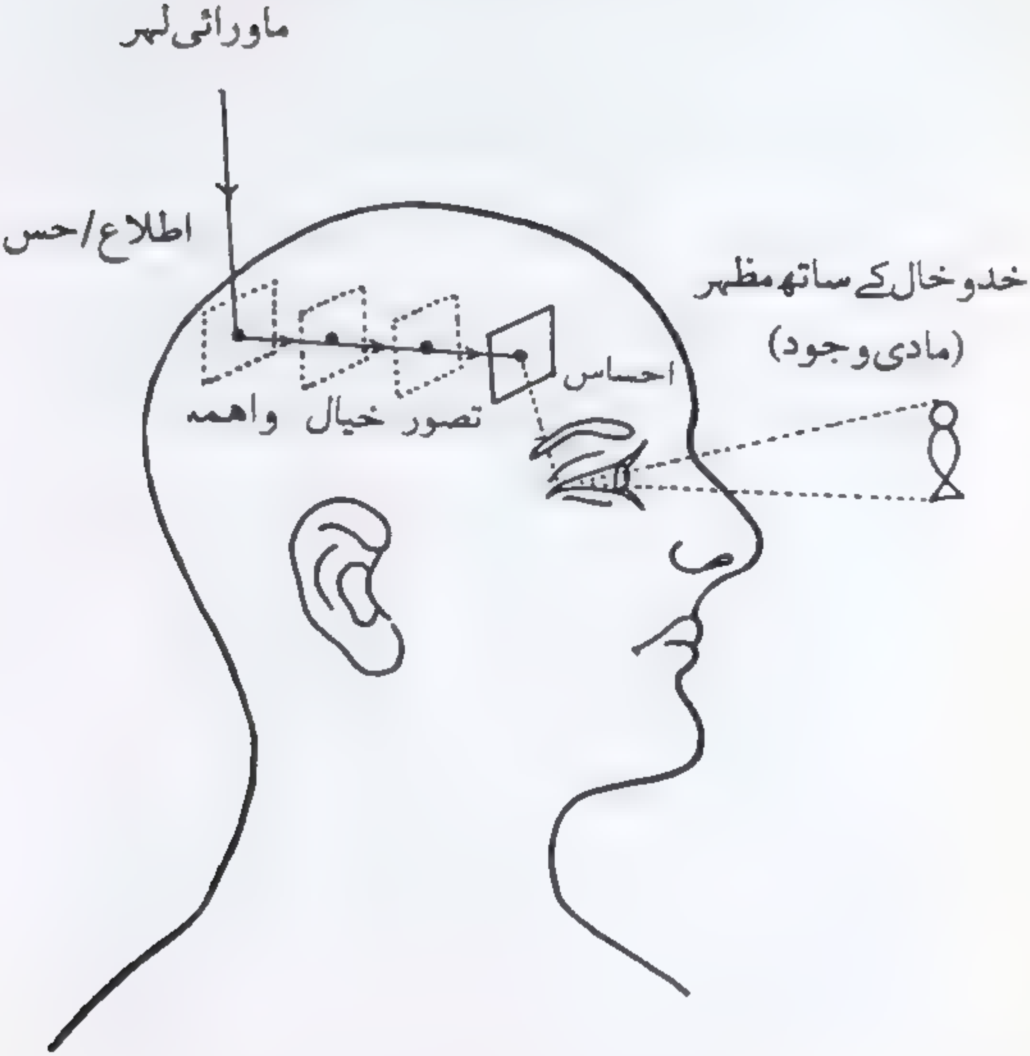
اس کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے اور ذہن میں یہ بات آنے لگتی ہے کہ فلاں چیز کے بارے میں خیال آرہا ہے۔ اس کیفیت کا نام تصور ہے اور پھر جب تصور میں گہرائی ہوجاتی ہے تو احساس بن جاتا ہے۔ احساس کے اندر جب رنگینی واقع ہوجاتی ہے تو وہ کیفیت جس کو ہم نے واہمہ، خیال، تصور اور احساس کہا ہے اپنے پورے خدوخال کے ساتھ مظہر بن کر ہماری مادی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

دنیاوی علوم کی طرزوں میں ہم ماورائی لہروں یا لکیروں کو ڈرائنگ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

مثال :

ایک کاغذ ہے جس میں سیدھی سیدھی لکیریں بنی ہوئی ہیں۔ ان سیدھی لکیروں میں کوئی تصویر ابھری ہوئی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کاغذ میں گراف بنا ہوا ہے۔ سیدھی لکیروں کو دوسری لکیر کاٹ رہی ہے۔ ان دونوں لکیروں کے عمل سے کاغذ کے اوپر چھوٹے چھوٹے چوکور خانے بن جاتے ہیں۔ ہم ان چوکور خانوں سے ایک تصور بناتے ہیں۔ تصویر بناتے وقت ان خانوں کو معین تعداد کے ساتھ تصویر کی بنیاد بناتے ہیں۔ ہم ان خانوں کے ناپ اور ان خانوں کی تعداد سے مختلف اعضاء کی ساخت کا تناسب قائم کرتے ہیں۔ اکہری لکیر یا دوہری لکیریں بھی تصویر کی

نسمہ کے تاثرات سے حسیات کی تشکیل



۱۔ اطلاع کے نزول سے دماغ کے اوپر پڑنے والا ہلکا سا دباؤ واھمہ کہلاتا ہے۔ شعور اس کی گرفت نہیں کرسکتا۔

۲۔ دباؤ میں گہرائی سے حواس میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور ذہن پر لہروں سے بنی تصویر کا ہلکا سا خاکہ بن جاتا ہے۔ اس کو خیال کہتے ہیں۔

۳۔ روشنیوں کے نزول میں مزید گہرائی سے نقش و نگار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ذہن اس کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو تصور کہتے ہیں۔

۴۔ تصور میں گہرائی پیدا ہونے سے احساس (حواس) پیدا ہو جاتے ہیں۔

۵۔ احساس کے اندر رنگینی شئے کو خدوخال کے ساتھ مظہر بنا کر سامنے لے آتی ہے۔

اصل ہیں۔ ان ہی لکیروں کی ضرب تقسیم سے نوعیں بنتی ہیں اور نوعوں کے خدو خال وجود میں آتے ہیں۔

احساس میں رنگینی پیدا ہونے کے بعد خدوخال مظہر بنتے ہیں۔ لیکن جب تک احساس کے اندر گہرائی اور رنگینی پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک ہم لہروں، لکیروں یا شعاعوں کو کسی رنگ کا نام نہیں دے سکتے۔

ماورائی لکیریں یا بے رنگ شعاعیں ہی کائنات اور افراد کائنات کی چھوٹی بڑی حرکات ہیں۔ ان لہروں، لکیروں یا بے رنگ شعاعوں کا جتنا اجتماع ہوتا ہے اور دماغی سکرین پر جس مناسبت سے بکھرتا ہے یا ذہن انسانی پر لہروں کے مسلسل نزول کے بعد ضرب تقسیم ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے حواس ترتیب پاتے ہیں۔ انہی لکیروں کی ضرب تقسیم کشش (Gravity) بن جاتی ہے۔ ان ہی لہروں اور ماورائی لکیروں کی حرکات اور گردشیں وقفہ بن جاتی ہیں۔

لہروں کی اجتماعیت ایک طرف ہمیں مکانیت سے آشنا کرتی ہے اور دوسری طرف زمانیت کا احساس دلاتی ہے۔ لہریں اپنی ضرورت اور طبعی تقاضہ کے تحت ممکن کی شکل و صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ نظریہ رنگ و نور میں لفظ ممکن اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جس چیز کو آخری درجہ میں مادی آنکھ دیکھ لے۔

چھٹی حس

انسان کو اصل وصف یا انسان کا اصل شرف یہ ہے کہ اللہ نے اسے اپنی نیابت عطا کی ہے۔ آدم بحیثیت خلیفۃ اللہ، اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کا حاکم ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے وہ کائنات کی حرکات و سکنات کو ایک ترتیب، توازن اور معین مقداروں کے ساتھ قائم رکھتا ہے۔

آدم بحیثیت خلیفۃ اللہ جو احکامات صادر کرتا ہے اس کا تعلق روحانی علوم سے ہے۔ روحانی علوم علم الاسماء کے شعبے ہیں۔ جب کوئی انسان علم الاسماء کے علم سے دور ہوجاتا ہے تو اس کے اندر شیطانی وسوسوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ شکوک اور شبہات اور وسوسوں میں مبتلا ہوکر اللہ کی صفت ربانیت کو بھولنے لگتا ہے اور اپنی اصل سے گریز کرتا رہتا ہے۔

تخلیق دراصل علم شئے ہے۔ جب تک کسی شئے کا علم نہیں ہوگا شئے وجود میں نہیں آئیگی۔ کائنات دراصل اللہ کا اپنا ذاتی علم ہے۔ کائنات اور کائنات کے تمام اجزاء ترکیبی پہلے سے اللہ کے ذہن میں موجود تھے۔ اللہ کے ذہن میں کائنات کی موجودگی ہی اللہ کا علم ہے۔ کلیہ یہ بنا کہ کائنات سے پہلے علم ہے پھر شئے ہے۔

علم شئے چونکہ براہ راست اللہ کا ذاتی علم ہے اس لئے اللہ کی طرح اس علم کو بھی بقائے دوام حاصل ہے۔ شئے (مادی وجود) چونکہ علم کے بعد کی مظاہراتی شکل و صورت ہے اس لئے اس کو بقا نہیں ہے۔ شئے کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ "ہر شئے" کسی ایک نقطہ یا مرکز کے ساتھ وابستہ ہے۔ شئے کی تخلیق میں یہ بات مخفی ہے کہ شئے ہر آن گھٹتی ہے اور ہر آن بڑھتی ہے۔ گھٹنے اور بڑھنے کا یہ عمل بالآخر فنا ہے۔

کوئی روحانی آدمی کسی شئے میں اپنے اختیار اور ارادے سے تصرف کرسکتا ہے۔ تصرف سے کسی شئے کے خدوخال میں تبدیل واقع ہوسکتی ہے۔ تصرف سے انسانی خیالات میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ تصرف علم شئے میں ہوتا ہے شئے میں نہیں ہوتا۔

ماورائی دنیا میں ہر لفظ شکل رکھتا ہے خواہ وہ وہم ہی کیوں نہ ہو۔ قانون یہ ہے کہ ہر شئے کی شکل و صورت ہوتی ہے۔ شکل و صورت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ٹھوس پن ہوتا ہے۔ وہ چیز ظاہر آنکھوں سے نظر آئے نہ آئے اس کی اندر خدوخال موجود ہوتے ہیں۔

ہر آدمی دیکھتا ہے کہ وہم کا مریض تقریباً زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ وہم کی طاقت سے اس کا دماغ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ زندگی ایک نقطے پر رک جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ معاشرے میں

ایک عضو معطل بن کر زندگی گزارتا ہے۔ وہم میں اگر شکل و صورت، وزن اور طاقت نہ ہو تو کوئی آدمی وہم میں مبتلا ہو کر مریض نہیں بن سکتا۔ ہوا ایک شئے ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن جب ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں تو اس کی طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اگر ہوا کی کوئی شکل و صورت نہیں ہے، ہوا میں خدو خال نہیں ہیں، ہوا میں طاقت نہیں ہے تو طوفانی ہواؤں سے بڑی بڑی بستیاں نیست و نابود کس طرح ہوجاتی ہیں؟ اس مشاہدے سے ہر فرد گزرتا ہے کہ جب ہوا تیز چلتی ہے تو انسان کے جسم پر ہوا کے اثرات براہ راست مرتب ہوتے ہیں۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی چیز جسم سے ٹکر کر گزر رہی ہے۔ اگر انسان کوشش کرے یا ایسے حالات اس کے ساتھ پیش آجائیں کہ جن حالات کی بناء پر وہ یکسو ہوجائے تو اس کے اندر چھٹی حس بیدار ہوجاتی ہے۔ نظریہ رنگ و نور کے مطابق ہر انسان کے اندر پانچ حواس کے علاوہ بے شمار حواس کام کرتے ہیں اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ پانچ حواسوں میں سے ہر حواس بے شمار حسوں سے مرکب ہے۔ اگر ان حواس کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو انسان کی مادی اور روحانی زندگی کے اندر جتنی حسیں کام کرتی ہیں ان کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہے۔

تخریب و تعمیر

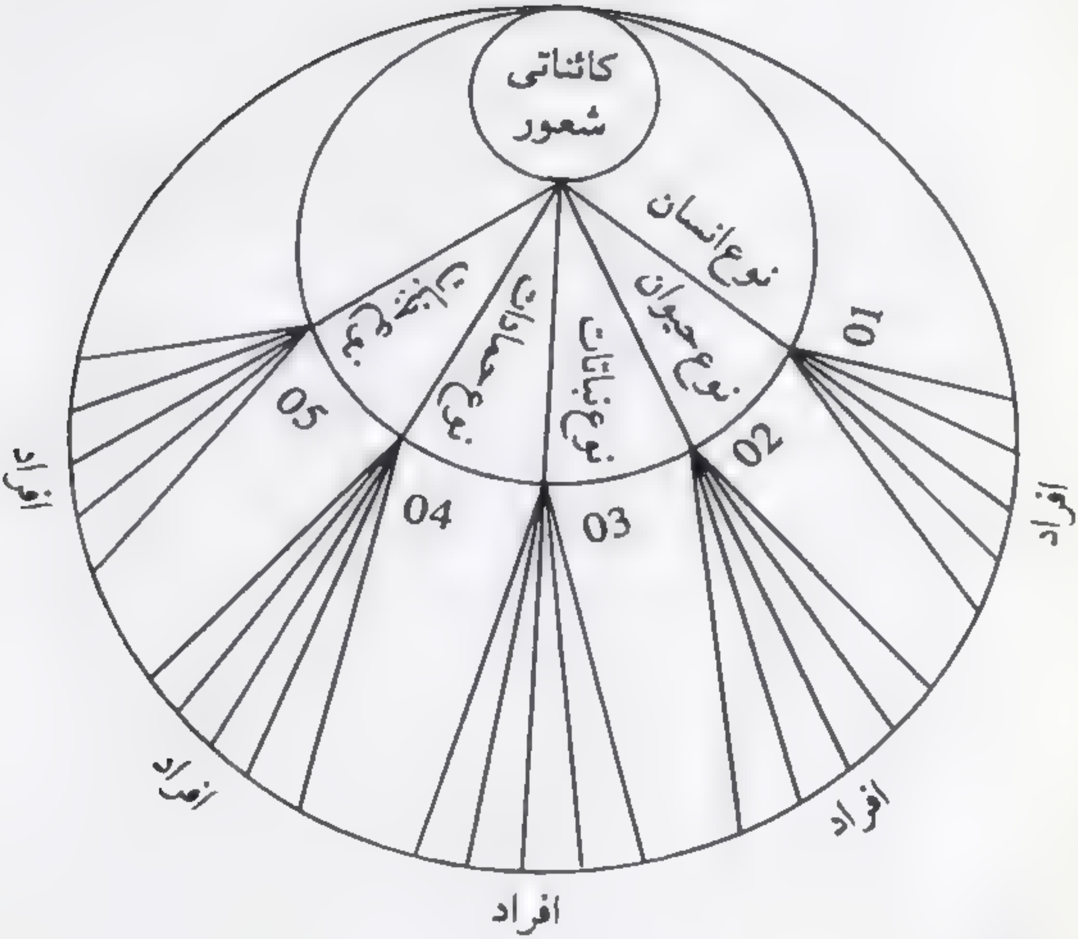
کائنات کی Base تجلی ہے۔ کائنات کی شروعات تجلی سے ہوتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے میں یہ تجلی مستقلاً گشت کرتی رہتی ہے اور اس طرح گشت کرتی ہے کہ شئے کے محدود ترین مرکز سے بھی گذرتی رہتی ہے شئے کے محدود ترین مرکز یا خول سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں جتنے ذرات ہیں ہر ذرے میں تجلی گشت کررہی ہے۔ تجلی کائنات کے اجزائے ترکیبی اور کائنات کے ہر ذرے کی مستقل اور متواتر حرکت ہے۔ اگر اس حرکت کو کائنات کے ذرات میں سے گذرتے وقت کوئی ناپسندیدہ عمل پیش آجائے تو اس کے اندر ایک طوفانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ حرکت میں عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ عدم توازن پیدا ہونے سے معین مقداروں میں تغیر پیدا ہوجاتا ہے چونکہ اللہ کے بنائے ہوئے ایک مکمل سسٹم میں تغیر واقع ہورہا ہے اس لئے عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی تخریبی اثر مرتب ہوجاتا ہے۔ عام حالات میں دیکھا جاتا ہے کہ انسانی جسم کے اندر خون دور کرتا رہتا ہے۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسانی فکر و خیالات کا اثر براہ راست خون اور جسم پر پڑتا ہے۔

خیالات اگر پراگندہ ہیں اور خیالات میں اگر کثافت ہے، بیزاری ہے تو خون کے اوپر اس کا اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی سڑی ہوئی غذائیں استعمال کرتا ہے یا ایک آدمی ایسے خیالات میں زندگی گزارتا ہے جو خیالات خود اس کے ضمیر کے لئے ملامت کا درجہ رکھتے ہیں تو ایسی زندگی سے اس کا جسمانی نظام اور شعوری واردات و کیفیات متاثر ہوتی ہیں۔

پھوڑے پھنسیاں، داد اور نامعلوم قسم کی بیماریاں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ انسانی ارادے میں اگر تخریب شامل ہوجائے تو اس کی قوتیں خیر کے برعکس کام کرنے لگتی ہیں۔ تجلی چونکہ خیر ہے اور تخریب کو ناپسند کرتی ہے اسلئے بے رخی اختیار کرلیتی ہے اور تجلی کی اس بے رخی سے خیر کی تاثیر معطل ہوجاتی ہے۔

ہر مذہب میں عبادت کے لئے غسل یا وضو کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ عبادت کا تعلق جسمانی اعضاء سے نہیں ہے۔ عبادت کا تعلق ذہن سے ہے اور ذہنی طور پر مرکزیت قائم کرنے سے ہے تو پھر غسل یا وضو کیوں ضروری ہے؟ عبادت کرنے سے پہلے جب ہم غسل یا وضو کا اہتمام کرتے ہیں تو اس اہتمام سے ہماری طرز فکر میں پاکیزگی اور طبعیت میں شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے۔ طبعیت کی یہ شگفتگی عبادت میں انہماک پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

معین مقداریں



مقدار صفر : کائناتی شعور کو ظاہر کرتی ہے کہ کائنات کے تمام افراد میں تقاضوں کی مقداریں مشترک ہیں۔ مثلاً بھوک پیاس بقائے نسل کا تقاضہ وغیرہ۔

مقدار نمبر ۰۱ سے ۰۵ : نوعی شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً مقدار نمبر ۰۱ نوع انسانی ہے۔ نمبر ۰۲ نوع حیوان اور اس طرح نمبر ۰۳،۰۴،۰۵ نوع نباتات، جمادات اور جنات ہیں۔ یہ جبلی تقاضوں کا دائرہ ہے جس میں ہر نوع اپنی جبلی تقاضوں پر عمل کرتی ہے۔

افراد کی تخلیق:

ہر نوع سے اس کے افراد کی متواتر تخلیق ہوتی رہتی ہے اور یہ انفرادی شعور ہے۔

ہر نوع معین مقداروں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے معین مقداروں کے ساتھ زندہ رہتی ہے اور معین مقداروں کے ساتھ فنا ہوجاتی ہے۔ ہم جب نوعی اعتبار سے نوع کے افراد کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور نوعی زندگی میں تقاضوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ہر نوع میں جذبات مشترک ہیں۔ زندگی کے اعمال اور جسمانی تقاضے مشترک ہیں۔ لیکن شکل و صورت اور جبلی تقاضوں کے لحاظ سے ہر نوع اور ہر نوع کے افراد الگ الگ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر جانور کی شکل و صورت بھی الگ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جس طرح انسان کو پیاس لگتی ہے اور پانی پی کر وہ اپنی پیاس بجھاتا ہے اسی طرح شیر، بھیڑ، بکری کو بھی پیاس لگتی ہے اور وہ بھی انسان کی طرح پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شیر کے طبعی تقاضے بکری کے طبعی تقاضوں سے مختلف ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں ہے کہ بھوک، پیاس، غیض و غضب اور جنسی تقاضے ہر نوع کے تمام افراد میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ تقاضوں میں یکسانیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ساری کائنات کسی ایک نقطے میں بند ہے۔ اس ایک نقطے سے کائنات کی تمام نوعیں اور نوع کے تمام افراد منسلک ہیں۔ شکل و صورت اور طبعیت کے لحاظ سے نوع اور نوع کے افراد کا الگ الگ ہونا اس بات کی علامت ہے

کہ نوعی تقاضے تقریباً ایک ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرد اپنی خاص عادت، خاص صلاحیت کا حامل ہے۔ نوعی اعتبار سے جب معین مقداریں کام کرتی ہیں تو ہر نوع کے افراد ایک دوسرے سے قربت محسوس کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے ہیں۔ لیکن جب نوع کے کسی فرد کو پیاس لگتی ہے تو عمل یکساں ہوجاتا ہے۔ اسلئے کہ کائنات میں موجود جتنی نوعیں ہیں ان سب کو پیاس لگتی ہے اور وہ سب اپنی پیاس پانی سے بجھاتی ہیں۔ شیر ہو، بھیڑ ہو، بکری ہو، پرندہ ہو، جن ہو یا کوئی اور نوع ہو۔ نوع کے ہر فرد میں یہ جاننا مشترک ہے کہ پانی پینے سے پیاس رفع ہوجاتی ہے۔

یقین

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرکے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو جاننے، پہچاننے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے غیر رب کی نفی کرنا ضروری ہے۔ غیر رب کی نفی کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں یہ مذکور ہے کہ انہوں نے شعوری حواس سے ہٹ کر لاشعوری حواس میں داخل ہو کر غور و فکر کیا۔

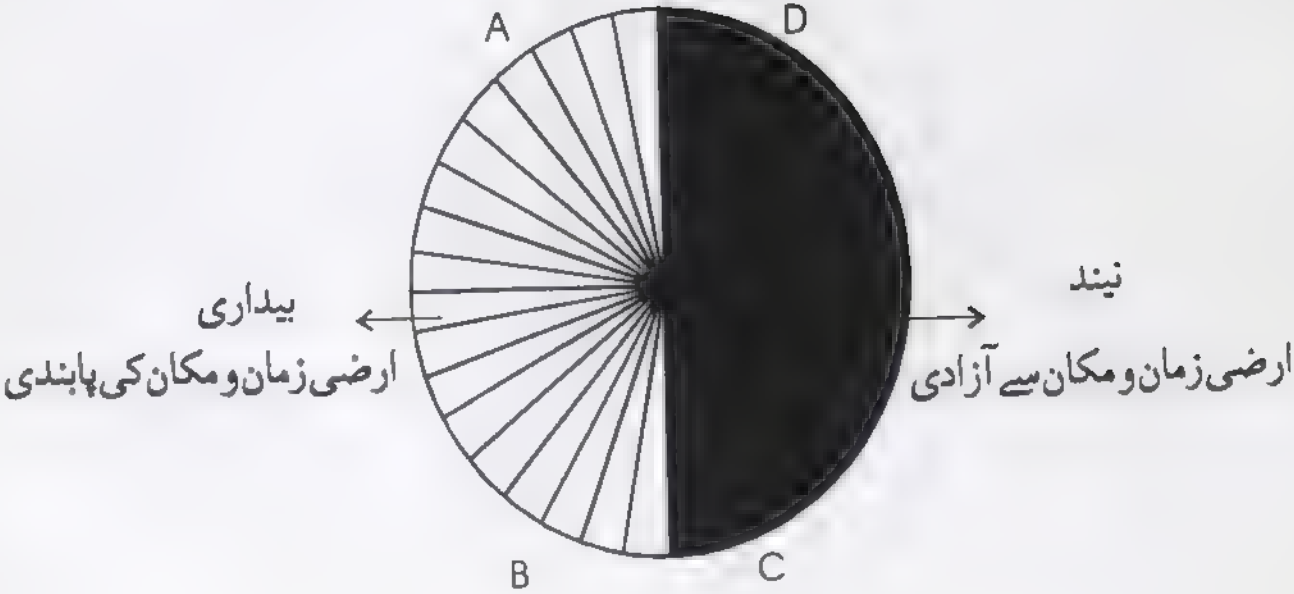
"جب رات کی تاریکی چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، ستارے کی چمک دمک دیکھ کر کہا کہ یہ میرا رب ہے اور جب ستارہ غروب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ غروب ہوجانے والا، چھپ جانے والا، گھٹ جانے والا معبود نہیں ہوسکتا اس کے بعد ستارے سے زیادہ روشن اور چمکدار چاند کو دیکھا چاند کو دیکھتے ہی دیکھتے یہ صورتحال سامنے آئی کہ چاند گھٹنے والی چیز ہے اور وہ بھی غروب ہوگیا اس کے بعد چاند سے زیادہ روشن سورج کو دیکھا اور یہ سوچا کہ اب تک دیکھی جانے والی چمکدار چیزوں میں سورج سب سے زیادہ روشن ہے بالآخر سورج بھی غروب

ہوگیا تو آپ نے فرمایا غروب ہونے والا خدا نہیں ہوسکتا اور میں اس خدا کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔"

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی گھٹنے والی چیز وہ کتنی ہی طاقتور ہو، کتنی ہی روشن ہو اور کتنی ہی بڑی ہو، قابل پرستش نہیں ہے کیوں کہ اس کے پیچھے کوئی بڑی طاقت موجود ہے جو اس کو آنکھوں سے اوجھل کررہی ہے اور پھر ظاہر کردیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس تفکر سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے جو انسان کو رب اور غیر رب میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ اسی صلاحیت کو پیغمبر اسلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نفس اور خالق کائنات اللہ نے قرآن پاک میں حبل الورید (رگ جان) کہا ہے۔

اگر کسی انسان میں نفس کو پہچاننے والی صلاحیت ختم ہوجائے تو ایسا بندہ رب سے متعارف نہیں ہوسکتا انسان اور انسانی زندگی کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو وسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کسی لمحے ٹھہرتی نہیں ہے۔ ہر لمحہ، ہر آن، ہر منٹ زندگی کی تجدید ہورہی ہے۔ اس تجدید کو قائم رکھنے کے لئے اللہ نے مادی وسائل پیدا کئے ہیں۔ مادی وسائل گیسیں،

زمان ومکان


A
D
B
C
بیداری
ارضی زمان ومکان کی پابندی
نیند
ارضی زمان ومکان سے آزادی

بیداری کے حواس میں حرکت کڑی در کڑی مرحلہ وار ہوتی ہے۔ یعنی ایک لمحہ پھر دوسرا لمحہ پھر تیسرا لمحہ۔

نیند کے حواس میں مرحلہ وار حرکت سے بندہ آزاد ہوتا ہے۔ یعنی ایک کے بعد یکدم دسواں، بیسواں لمحہ آجاتا ہے۔

بیداری کے عالم میں A مقام سے B مقام تک کوئی فرد اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک درمیان کے دوسرے مقامات طے نہ کرلے۔

جب کہ رات کے حواس میں C مقام سے D مقام تک پہنچنے کے لئے درمیانی مقدمات سے گزرنا ضروری نہیں ہے۔

روشنی، ہوا، پانی اور غذا وغیرہ ہیں۔ انسان کے اوپر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس کی جسمانی ساخت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود ہوا، پانی اور غذا سے زندگی کی تجدید نہیں ہوتی۔ مادی دنیا میں اس حالت کا نام موت ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے جسمانی اعضاء ناک، منہ، آنکھ اور کان موجود رہتے ہیں۔ ان چیزوں کی برقرار رکھنے والے وسائل بھی موجود ہیں۔ لیکن ہوا، پانی کسی طرح کی غذا آدمی کی زندگی کو بحال نہیں کرتی۔ زندگی کا دارو مدار ہوا، پانی اور غذا پر ہوتا تو مردہ جسم کو ان چیزوں کے ذریعے زندہ کرنا ممکن ہوجاتا۔ ہم اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں کہ مادی وسائل سے زندگی کی تجدید نہیں ہورہی ہے۔ جب زندگی کا دارومدار صرف ہوا، پانی اور غذا پر نہیں ہے تو کوئی نہ کوئی ہستی ایسی موجود ہے جس کے اوپر انحصار کرنا امر مجبوری ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس نے انسان کے لئے دوسرے تمام وسائل پیدا کئے ہیں۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے سب چیزوں کو دو دو قسموں پر پیدا کیا" ۔ (قرآن)

ان دو قسموں کو سمجھنے کے لئے ہمیں انسان کے اندر کام کرنے والے شعوری اور لاشعوری حواس کو سمجھنا پڑے گا۔ شعوری اسباب زیر بحث آتے ہیں تو ہمارا واسطہ ہر ہر قدم پر غیر رب

سے پڑتا ہے اور ہم زندگی گزارنے کے لئے رب کے علاوہ دوسری بہت ساری چیزوں سے اپنا رشتہ قائم کرلیتے ہیں۔ زندگی کا تجزیہ ہمارے اوپر منکشف کرتا ہے کہ انسانی زندگی آدھی شعوری اور آدھی لاشعوری حواس میں گزرتی ہے۔ برملا یوں کہا جاسکتا ہے کہ عمر کا زیادہ حصہ لاشعوری حواس میں گزرتا ہے۔

مثال :

انسان پیدا ہوتا ہے دس سال کی عمر تک لاشعوری زندگی گزارتا ہے لیکن شعوری زندگی میں فی الواقع افہام و تفہیم نہیں ہوتی دس بارہ سال یا آٹھ نو سال کی شعوری زندگی میں اگر نیند کا وقفہ شمار کرلیا جائے تو لاشعوری زندگی، شعوری زندگی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ اگر انسان شعوری زندگی میں رہتے ہوئے لاشعوری زندگی میں زیادہ حصہ گزارے تو اسے روحانی بیداری میسر آجاتی ہے۔

زندگی کا ایک وقفہ یہ ہے کہ انسان شعوری حواس میں کام کرتا ہے۔ اس وقفہ کو بیداری کہا جاتا ہے۔ شعوری حواس یا بیدار میں ہمارے اوپر زمان و مکان Time and Space کا غلبہ رہتا ہے۔ یعنی ہم خود کو ہر ہر قدم پر مقید اور پابند محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے مرحلے اور دوسرے وقفے نیند کی حالت میں ہمارے اوپر سے ارضی زمان و مکان کی پابندی ٹوٹ

جاتی ہے اورجب ارضی زمان و مکان کی پابندی ٹوٹ جاتی ہے تو ہم اس دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں جس دنیا میں ارضی زمان و مکان نہیں ہیں۔

شعوری طور پر غیر رب کی نفی کرنے سے انسان کے اوپر سے زمان و مکان کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ روحانی زندگی حاصل کرکے غیب کی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ جب ہم روحانیت کے علوم سے بحث کرتے ہیں تو لازماً ہمیں الہامی کتابوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آخری الہامی کتاب قرآن انسان کے لئے ایک طرف روحانی ورثہ ہے۔ دوسری طرف ماورائی علوم کی دستاویز ہے۔ ایسی دستاویز جس میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے۔ سورۃ بقرۃ کی پہلی آیتوں میں اللہ نے اس قانون کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"یہ کتاب! نہیں ہے شک اس میں -------- یہ کتاب ان لوگوں کو ہدایت دیتی ہے جو متقی ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر یقین رکھتے ہیں"

باطن روشن علماء قرآن کے ان الفاظ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اگر بندے کے اندر شک اور وسوسہ ہے تو یہ کتاب اس بندے کی رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ کتاب صرف ان لوگوں پر ھدایت کے راستے کھولتی ہے جو منافق نہیں ہیں۔ آخری کتاب

قرآن کے ارشاد کے مطابق متقی لوگوں کی نشانی اور صفت یہ ہے کہ وہ غیب کے اوپر یقین رکھتے ہیں۔ غیب سے مراد وہ تمام چیزیں، وہ تمام عوامل، وہ تمام حالات اور وہ تمام دنیائیں ہیں جو ظاہراً آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ قانون یہ بنا کہ غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے غیب کی دنیا پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ یہ بات امر مسلمہ ہے کہ ان دیکھی چیزوں پر یقین کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یہ قانون صرف غیب کی دنیا میں ہی نافذ نہیں ہے، ہماری روز مرہ زندگی میں بھی یہ قانون نافذ اور جاری و ساری ہے۔ نوع انسانی کی زندگی کا ہر شعبہ اس قانون کا پابند ہے۔ اس قانون کی حدود میں رہتے ہوئے جب ہم زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں یا اپنے افعال و کردار کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہم یہ جان لیتے ہیں کہ جب تک ہم کسی چیز کی طرف یقین کے ساتھ متوجہ نہیں ہوتے ہم اسے نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔

مثال :

ایک آدمی کسی درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہیں یا آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن درخت کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کہ درخت موجود ہے اس کی آنکھوں کے سامنے نہ تو درخت کی ساخت آتی ہے اور نہ ہی اس کی نظروں کے سامنے پھول پتیاں اور رنگ آتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر

وہ درخت کو دیکھتا ہے تو درخت کی ساخت، درخت کے پھول، درخت کی پتیاں، درخت کے رنگ، درخت کی اونچائی، درخت کا پھیلاؤ سب نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ درخت دیکھنے سے پہلے ہمیں اس بات کا یقین کرلینا پڑتا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے درخت ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ درخت موجود ہے۔ ہمارے ادراک میں یہ بات موجود ہے کہ دنیا میں ہزارہا درخت موجود ہیں لیکن اگر قانون کی شرط پوری نہ کرکے درخت کو ایک حقیقت تسلیم کرنے کے بعد درخت کا مشاہدہ نہ کیا جائے تو ہم درخت کو نہیں دیکھ سکتے۔ درخت دیکھنے کے لئے پہلے درخت کی موجودگی کا تصور ذہن میں موجود ہونا ضروری ہے اور درخت سے متعارف ہونے کے لئے ادراک سے ایک قدم باہر آکر درخت کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔ یہی صورت غیب کی دنیا کی ہے۔

مثال :

ہم ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کرتے ہیں۔ سفر ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں شہر کی موجودگی کا یقین ہے۔ جب ہم سفر کرکے یقین کے سہارے آگے بڑھتے ہیں تو ہم شہر کو دیکھ لیتے ہیں۔ شہر کی موجودگی کا یقین ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کا یقین اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہم نے کوئی نہ کوئی شہر پہلے سے دیکھا ہوا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ شہر میں سڑکیں

ہوتی ہیں مکانات ہوتے ہیں۔ مکانات میں انسان بستے ہیں۔ شہر میں درخت ہوتے ہیں۔ یہی حال غیب کی دنیا کا ہے۔ جس طرح دنیا میں ہزارہا شہر ہیں اسی طرح خلاء سے اس پار غیب کی لاکھوں دنیائیں آباد ہیں۔ جن کی تعداد اربوں کھربوں بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ہمارے اندر غیب کی کسی دنیا کا مشاہدہ موجود نہ ہو تو ہم کسی بھی غیب کی دنیا میں داخل نہیں ہوسکتے اور اس ہستی تک نہیں پہنچ سکتے جو غیب الغیب سے ماوراء ہستی ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو ہماری مادی اور روحانی دنیا میں نافذالعمل ہے۔

مثال :

ہر بچہ ماں باپ کی بتائی ہوئی بات کو حقیقت تسلیم کرکے اس سے استفادہ کرتا ہے۔ نوع انسانی میں جتنے بھی بچے ہیں ان کی تربیت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ بچے ماں باپ کے کہنے پر ماں باپ کی بتلائی ہوئی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ماورائی دنیا کا ہر مسافر یہ جانتا ہے کہ زندگی یقین کے اوپر رواں دواں ہے۔ کائنات میں انتظامی امور کا قانون مادی دنیا اور ماورائی دنیا دونوں میں نافذ ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے، ہر بچہ کے اندر غذائی ضرورت پوری کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ وہ غذائی ضرورت پورا کرنے کے لئے روکر اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد بچے کے اندر یہ شعوری صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ماحول

میں موجود سب سے قریب ہستی کو پہچانتا ہے۔ بچے کے اندر پہچاننے کا ایک بڑا ذریعہ قوت شامّہ ہے یعنی وہ ماں کو ماں کی خوشبو سے پہچانتا ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے بچے کے شعور میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ شعور میں مسلسل اضافے سے جو کیفیت شعور میں داخل ہونے کے بعد مستحکم ہوتی ہے اس کیفیت کا نام یقین ہے۔ ماں باپ اگر پانی کو پانی کہتے ہیں تو بچہ بھی پانی کہتا ہے۔ علیٰ ھذاالقیاس جتنی چیزیں ماحول میں موجود ہیں ان سب کا نام اور اشیاء کی خاصیتیں بچہ من و عن اسی طرح قبول کرتا ہے۔ جس طرح والدین کے ذہن میں موجود ہیں۔ بچہ جب شعور کے اس دور میں داخل ہوتا ہے جہاں علم سیکھنے کا وقت آتا ہے وہاں بھی ہمیں یقین کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ استاد ایک لمبی لکیر کو "الف" کہتا ہے۔ بچہ اس یقین کے ساتھ جو اسے ماحول سے منتقل ہوا ہے استاد کے کہنے پر الف کہتا ہے اور یقین اس کی زندگی پر محیط ہوجاتا ہے۔ کبھی کسی نے نہیں دیکھا کہ کسی بچے نے بوڑھے ہو کر اس بات کی تردید کی ہو کہ سیدھی لکیر الف نہیں ہے۔ قانون یہ بنا کہ جس طرح شعوری دنیا میں داخل ہونے کے لئے یقین کا ہونا ضروری ہے اسی طرح لاشعوری دنیا سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے یقین بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔

یقین کہاں ہوتا ہے ؟

جہاں بھی ہوتا ہے اسے انا، ذات انسانی Internal Ego کہتے ہیں۔ انا یا ذات کی اصل خالق کائنات کی صفات ہیں جن کے ذریعے کائنات کے تمام افراد اور کائنات کے تمام افراد کے حواس ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

مثال :

ایک تالاب ہے۔ اس تالاب میں ایک چھوٹی سی کنکری پھینک دی جائے تو تالاب میں دائرے بنتے ہیں۔ یہ دائرے بیچ سے شروع ہوکر تالاب کے چاروں کناروں پر گھوم جاتے ہیں۔ یہ دائرے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

تالاب میں ہر لہر کسی ایک نوع کی شکل و صورت کا نام ہے۔ اس شکل و صورت کا نام ایک طرف نوع ہے اور دوسری طرف فرد ہے۔ جب ہم نے تالاب میں کنکر پھینکا تو تالاب کے اندر بیشمار لہریں دائروں کی شکل میں متحرک ہوگئیں۔ یعنی لہروں کا وجود تالاب کے اندر موجود تھا۔ یہ وجود لہروں کی شکل میں سطح تک پہنچا۔ تالاب کے اندر سے نکل کر تالاب کی سطح پر لہر بننا فرد کا شعور ہے۔ جب تک لہر تالاب کے پانی کے اندر ہے وہ فرد کا لاشعور ہے۔ تالاب کائنات کا اجتماعی شعور ہے۔ جب ہم نے یہ بات تسلیم کرلی کہ تالاب کی سطح پر ابھرنے والی تمام

لہریں کائنات کے افراد ہیں تو یہ بات لازماً ماننی پڑے گی کہ ساری کائنات ایک مخفی رشتے میں بندھی ہوئی ہے اور وہ مخفی رشتہ تالاب کا پانی ہے۔

مثال :

جب آدمی سورج کو دیکھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ میں سورج کو جانتا ہوں۔ ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ سورج بھی میری طرح اس کائنات کا ایک فرد یا ایک رکن ہے۔ بظاہر سورج کے ساتھ انسان کا کوئی رشتہ نظر نہیں آتا لیکن جب ایک انسان سورج کو دیکھتا ہے تو سورج سے اپنے اندر قربت کا احساس محسوس کرتا ہے۔ یہ بات ذہن میں نہیں آتی کہ سورج سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہی رشتہ یا آپس میں ربط وہ مخفی احساس ہے جو تالاب کی تہہ میں ہر نوع کے ہر فرد کو حاصل ہے۔ اسی ربط کی وجہ سے کائنات کا ہر ذرہ ایک دوسرے سے متعارف ہے۔

نسل کشی کے سلسلے پر غور کیا جائے تو کائنات میں درخت اور تمام حیوانات، جمادات اور نباتات اس صفت میں انسان کے ساتھی ہے۔ ان مشاہدات اور تجربات کے پیش نظر یہ ماننا امر مجبوری ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو ہر چیز پر محیط ہے اور جس طرح وہ ہستی چاہتی ہے اسی طرح کائنات کے افراد زندہ اور

متحرک رہتے ہیں۔ چونکہ انسان کی اصل اور انسان کی بنیاد روشنی کے سمندر کی تہہ پر ہے اس لئے وہ اپنی اصل سے واقف ہوکر کائنات کو دیکھ لیتا ہے۔ جب تالاب کی تہہ میں یا غیب کے سمندر میں حرکت ہوتی ہے تو فرد کو اس کا اس لئے علم ہوتا ہے کہ فرد کی اصل سمندر یا تالاب کی تہہ ہے۔

آنکھ

فرد کی ایک حرکت جسمانی خدوخال کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ جسمانی خدوخال کے ساتھ واقع ہونے والی حرکت کو ہم منفرد یا اختیاری حرکت نہیں کہہ سکتے۔ یہ حرکت بہرحال کسی نہ کسی حرکت کے تابع ہے۔ جسمانی خدوخال کے ساتھ جو حرکات صادر ہوتی ہیں وہ تمام شعوری حرکات ہیں۔ جن کو خارجی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس مخفی احساس کے اوپر جسمانی وجود حرکت کرتا ہے وہ داخلی زندگی یا فرد کا لاشعور ہے۔ خارجی اور داخلی زندگی کی مثال یہ ہے پانی ایک ضرورت یا تشنگی ہے۔ پیاس شئے کا ایک رخ ہے اور پانی دوسرا رخ ہے۔ پیاس روح کی شکل و صورت اور پانی جسم کی شکل و صورت ہے۔ جب ہم پیاس کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو رخ آتے ہیں۔ ایک رخ روح اور دوسرا جسم۔ یہ دونوں رخ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ اگر دنیا سے پیاس کا احساس ختم ہوجائے تو پانی بھی فنا ہوجائیگا۔ پانی اس لئے موجود ہے کہ پانی کی روح موجود ہے۔ زندگی کا تعارف خدوخال اور نقش و نگار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زندگی کا ایک حصہ خدوخال اور نقش و نگار پر مشتمل

ہے اور دوسرا حصہ رفتار کے اوپر قائم ہے۔

ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے، مخصوص خدوخال اور نقش و نگار کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ ان ہی مخصوص خدوخال کے ساتھ ساٹھ ستر سال زندہ رہتا ہے، نقش و نگار اور خدوخال میں جیسے جیسے تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جیسے جیسے قد و قامت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تبدیلی نظر آتی ہے۔ پیدائش سے ساٹھ ستر سال کا وقفہ ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ زندگی جس وقت پر رواں دواں ہے، جس کو شعور دن اور ماہ و سال میں ریکارڈ کرتا ہے اس کو ہماری ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ زندگی کا ایک رخ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور دوسرا رخ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ وہ رخ جو آنکھوں کے سامنے ہے اور جس میں ہم نقش و نگار اور خدوخال کا بڑھنا گھٹنا دیکھتے ہیں سب کا سب مکان Space ہے اور جس خلاء میں یہ خدوخال گھٹ رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں اور جو آنکھوں سے اوجھل ہے وہ زمان Time ہے۔ انسان جہاں سے آیا ہے آنے کے بعد اس کا بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا یا مرنے کے بعد جہاں چلاگیا ہے وہ Time ہے اور انسان نے جس طرح بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو خدوخال کے ساتھ محسوس کیا وہ Space ہے۔ جب ہم زمان کا تذکرہ کرتے ہیں تو نظریہ رنگ و نور کے مطابق ساری کائنات زمانیت میں ایک

دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ ہے اور جب ہم مکانیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو کائنات نوعی اعتبار سے اور انفرادی اعتبار سے الگ الگ ہے۔ ہم بھیڑ، بکری، بندر، چوہا، کتا اور انسان کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو زندگی اور انرجی سب میں مشترک ہے۔ جب ہم نوعی اعتبار سے کائنات کا تذکرہ کرتے ہیں یا Space کی حدود کا تذکرہ کرتے ہیں تو چوہا، بندر اور ہاتھی الگ الگ خدوخال میں نظر آتے ہیں۔

تخلیقی فارمولا یہ بنا کہ زندگی دو رخوں پر قائم ہے۔ ایک رخ زمان ہے اور دوسرا رخ مکان ہے۔ جو ایک طرف گھٹتا ہے دوسری طرف بڑھتا ہے اور Record ہوجاتا ہے۔

زندگی جس رخ پر قائم ہے سب کا سب Time ہے۔ زندگی جس رخ پر گھٹ رہی ہے، بڑھ رہی ہے یا فنا ہورہی ہے سب کا سب Space ہے۔ زمانیت یا ٹائم میں کائنات کا ہر فرد ایک دوسرے کو پہچانتا ہے اور ایک دوسرے سے متعارف ہے۔ سورج کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سورج جس طرح ہماری خدمت گذاری میں مصروف ہے اسی طرح زمین پر موجود ہر مخلوق کی خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر جب ہم زمین سے سورج کو دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کور چشمی محسوس نہیں کرتی۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم اپنا رشتہ

زمانیت سے قائم کرلیتے ہیں تو ہمارے لئے فاصلے معدوم ہوجاتے ہیں۔ ہماری آنکھ جو چند سو فٹ سے آگے نہیں دیکھ سکتی نو کروڑ تیس لاکھ میل دور دیکھ لیتی ہے۔

کائنات میں یا افراد کائنات میں تعارف کے لئے جو روشنی ذریعہ بن رہی ہے وہ ازل سے ایک ہی طرز پر قائم ہے۔ کائنات کے تمام افراد کی روح ایک ہے لیکن جسمانی خدوخال الگ الگ ہیں۔ جہاں روح ایک ہے وہاں ہر شئے میں اشتراک ہے مثلاً بھوک بکری کو بھی لگتی ہے، بھوک انسان کو بھی لگتی ہے، کبوتر کو بھی لگتی ہے، بھوک کا لگنا زمانیت ہے۔ لیکن انفرادی طور پر جب خدوخال مکانیت بنتے ہیں تو غذا الگ الگ ہوجاتی ہے۔ بھوک لگنا زمانیت پر قائم ہے اور بھوک کو مختلف چیزوں سے رفع کرنا اسپیس یا مکانیت ہے۔

مراقبہ

روشنی خلاء ہے اور خلاء ایک وجود ہے۔ خلاء مسلسل حرکت ہے اور ہر حرکت نزول و صعود میں سفر کررہی ہے۔ نزول و صعود کے مختلف دائرے ہیں۔ حرکت کے پہلے دائرے کا نام "عالم ملکوت" ہے۔ عالم ملکوت میں مادی عناصر موجود نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ملکوت مادی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

روشنی = خلاء = وجود = حرکت

روشنی حرکت بن کر اکہری اور دوہری سمتوں میں بہتی ہے۔ اکہری حرکت زمان ہے۔ خلاء کے اندر فاصلہ اور حرکت ایک جگہ جمع ہوجائیں تو اس دوہری حرکت کا نام مکان ہے۔ دوہری حرکت کو موالید ثلاثہ (نباتات، جمادات اور حیوانات) بھی کہا جاتا ہے۔ انسان کی ذات میں جو روشنیاں کام کررہی ہیں دو حرکت پر قائم ہیں۔ ایک حرکت کشش ہے یعنی انسان اپنی بساط کی طرف کھینچ رہا ہے۔ دوسری حرکت یہ ہے کہ انسان زندہ رہنے کے لئے روشنیاں اپنے اندر جذب کررہا ہے۔ وہ حرکت جو اس ہستی کی طرف کھینچ رہی ہے جس ہستی کے حکم سے کائنات وجود میں آئی ہے "ملکوتی صفت" کہلاتی ہے اور وہ روشنی جو گریز کی شکل میں

انسان کو دور کررہی ہے "صفت بشری" ہے۔ ان دونوں صفات میں ہر صفت ایک اصول کی پابند ہے دنیا میں رہتے ہوئے کوئی آدمی خارجی دنیا میں جتنا زیادہ مستغرق ہوجاتا ہے اسی مناسبت سے وہ کشش کی روشنیوں سے دور ہوجاتا ہے۔ جو آدمی کشش کی روشنیوں سے دور ہوتا ہے اس کی ذات کے اندر روشنیاں یا انوار ضائع ہوتے رہتے ہیں۔ آدمی جتنا زیادہ گریز (مکانیت) میں داخل ہوتا ہے اسی مناسبت سے اس کے اندر سے "ملکوتی صفت" کم ہوتی رہتی ہے۔ نتیجہ میں وہ عالم ملکوت سے دور ہوجاتا ہے اور اتنا دور ہوجاتا ہے کہ اس کے علم میں یہ بات ہی نہیں رہتی کہ انسان کے اندر "صفت ملکوتیت" کام کرتی ہے۔ جو فی الواقع اس کی اپنی اصل یا بساط ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے اتنا دور ہوجاتا ہے کہ اس کی تمام دلچسپیاں مکانیت میں مجتمع ہوجاتی ہیں اور وہ صفت ملکوتیت سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ یہ وہی صورت حال ہے جس کے بارے میں آخری کتاب قرآن میں خالق کائنات اللہ نے کہا ہے۔

"ہم نے ان کے دلوں پر مہر کردی اور کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے لئے عذاب الیم ہے۔۔۔ (القرآن)

عذاب الیم سے مراد یہ ہے کہ وہ صفت ملکوتیت سے محروم

کردیئے گئے۔ عالم ملکوت اور عالم ناسوت کے تخلیقی فارمولوں کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ملکوتی صفت اور بشری صفت میں امتیازی خط کھینچنے والی روشنی کی ایک مقدار معین ہے۔ روشنی کی مقدار میں توازن بشری تقاضے پیدا کرتا ہے اور جب بشری تقاضے زیادہ ہوجاتے ہیں تو خارجی دنیا (مکانیت) میں انسان کا استغراق بڑھ جاتا ہے اور ایسا ہونے سے انسان اسفل میں چلاجاتا ہے۔ انسان جتنا زیادہ اسفل کی طرف بڑھتا ہے اسی مناسبت سے اس کے اندر کثافت اور Gravity میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

خالق کائنات اللہ نے آدم علیہ السلام سے کہا تھا کہ تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور جہاں سے دل چاہے خوش ہوکر کھاؤ پیو اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ خوش نہ ہونا عالم اسفل (مکانیت) ہے۔ نافرمانی اور ناخوشی بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آدمؑ کا اللہ سے عارضی طور پر رشتہ منقطع ہوگیا۔ جیسے ہی رشتہ منقطع ہوا، اسی مناسبت سے روشنیوں کا توازن کم ہوکر عارضی طور پر ٹوٹ گیا اور آدم بشری خول میں بند ہوگیا اور اس مقام پر آدم نے خود کو ننگا محسوس کیا۔ ننگا محسوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدم کے اوپر کثافتوں کا ہجوم ہوگیا۔ جیسے ہی آدم کے اوپر کثافتوں کا ہجوم ہوا، آدم نے خود کو جنت کی فضا سے کوئی الگ چیز سمجھا۔ جب آدم کی

دلچسپیاں روشنیوں سے دور ہوئیں تو کثافتوں نے آدم کو کھینچ لیا۔ کثافتوں اور ثقل کی کشش نے جب آدم کی اپنی طرف کھینچا تو آدم اسفل میں قید ہوگیا اور جنت کی فضا نے آدم کو رد کردیا۔

آدم جب تک کشش ثقل میں داخل نہیں ہوا وہ زمانیت میں رہا۔ آدم کو نافرمانی کے احساس نے مکانیت میں قید کردیا۔ آدم نے کشش سے گریز کرکے اپنے اوپر ملکوتیت کے دروازے بند کرلئے۔ جب کوئی آدم زاد گریز سے کشش میں داخل ہوجاتا ہے تو اس پر عالم ملکوت کے دروازے دوبارہ کھل جاتے ہیں۔

ماورائی دنیا میں داخل ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان مکان کی قید سے آزاد نہ ہو۔ آزاد ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان جسمانی تقاضوں کو ثانوی حیثیت دے دے اور جہاں سے تقاضے روشنی کی شکل میں نزول کررہے ہیں ان کی طرف متوجہ ہوجائے روشنی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے ذہنی یکسوئی کے ساتھ مراقبہ بہترین عمل ہے۔ اسکا آسان طریقہ یہ ہے کہ :

1۔ آدمی کسی تاریک گوشے میں جہاں گرمی، سردی معمول سے زیادہ نہ ہو بیٹھ جائے۔

2۔ ہاتھ، پیر اور جسم کو ڈھیلا چھوڑدے اور اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کرلے جس کیفیت میں ذہن جسم کی طرف سے ہٹ جائے۔

3۔ سانس گہرائی میں لیا جائے۔ گہرائی میں سانس لینے سے سانس کی رفتار میں ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔

4۔ آنکھیں بند کرلی جائیں اور اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کی جائے۔

5۔ خیالات پاکیزہ ہوں۔

6۔ عمل کی پاکیزگی یہ ہے کہ آدمی کسی کو برا نہ سمجھے۔ کسی کی طرف سے بغض و عناد نہ رکھے، اگر کسی سے تکلیف پہنچتی ہے تو معاف کردے، انتقام نہ لے۔

7۔ ضروریات زندگی اور معاش کے حصول میں اعضاء کا وظیفہ پورا کرکے جدوجہد میں کوتاہی نہ کرے لیکن نتیجہ کے اوپر نظر نہ رکھے۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔

8۔ اپنے کسی عمل سے یہ محسوس ہوجائے کہ مجھ سے زیادتی ہوگئی ہے تو بلا تخصیص، وہ ناتواں ہوا، کمزور ہو، چھوٹا ہو، اس سے معافی مانگ لی جائے۔

9۔ جو کچھ اپنے پسند کرتا ہے دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔

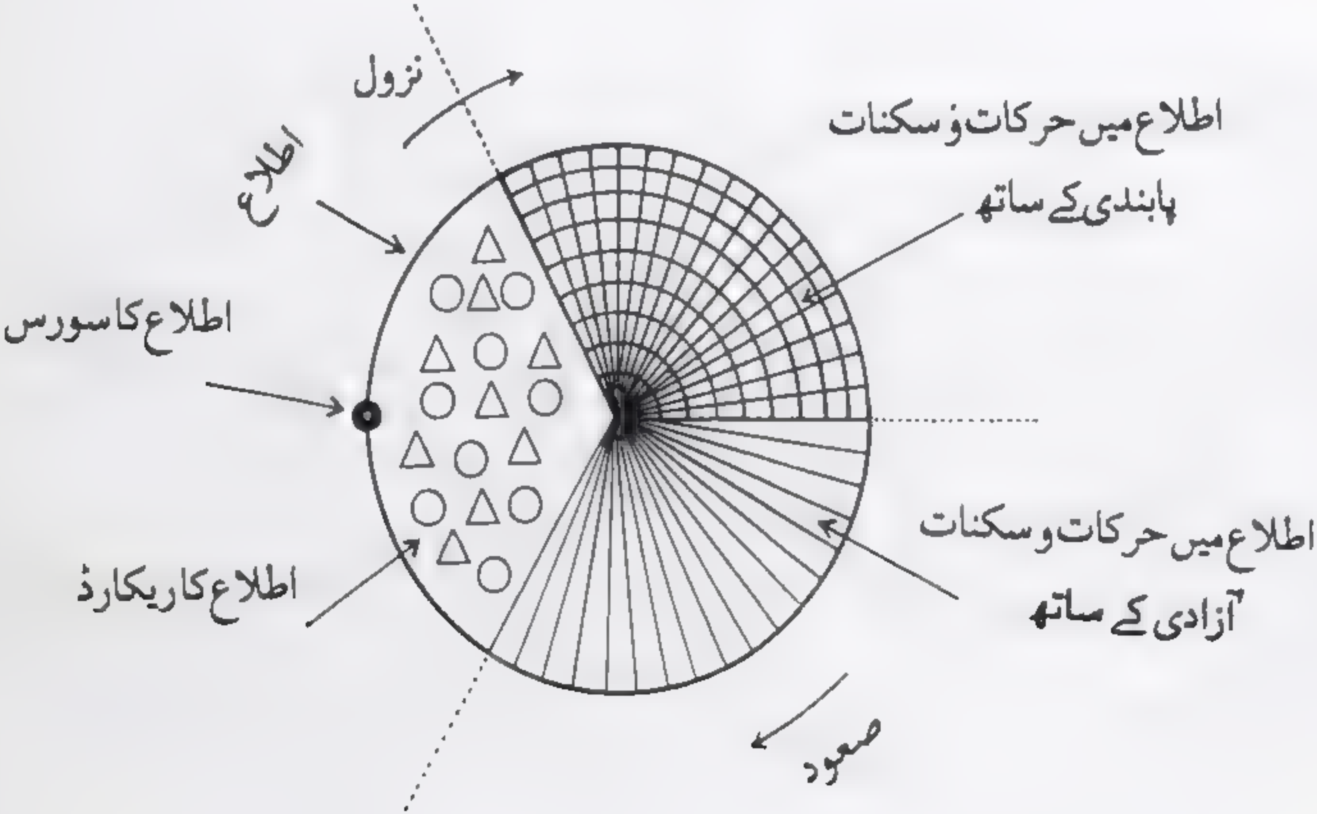
10۔ ذہن کے اندر مال و متاع اور اسباب کی محبت نہ ہو۔ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل کو خوش ہوکر استعمال کرے۔ لیکن وسائل کو مقصد قرار نہ دے۔

11۔ اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنے کا جذبہ دل میں موجود ہو۔
جس طرح ممکن ہو اللہ کی مخلوق کی خدمت کرے۔

جس شخص کے اندر پاکیزہ خیالات، پاکیزہ اوصاف موجود ہوتے ہیں اس کی ذات میں جلا پیدا ہوجاتی ہے۔ شعور کا آئینہ صیقل اور شفاف ہوجاتا ہے۔ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس عمل میں روحانی استاد کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ شاگرد کے اندر اگر چوں چرا ہے اور تعمیل نہیں ہے تو مراقبے کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لئے خود سپردگی ضروری ہے۔

جسم کا تعلق سانس سے ہے۔ سانس کی آمد و شد ختم ہوجائے تو جسم بے جان ہوجاتا ہے۔ روحانیت سیکھنے کے لئے سانس سے قطع تعلق کرنا ضروری نہیں ہے۔ صرف سانس کا بہت آہستہ ہونا ضروری ہے۔ جب انسان اپنا تعلق گوشت کے جسم سے سانس کی حد تک قائم رکھتا ہے تو جسم غیر محسوس ہوجاتا ہے۔ اسکی مثال خواب دیکھنا ہے۔ آدمی خواب میں سانس لیتا رہتا ہے خواب یا سونے کی حالت میں سانس کے اندر گہرائی پیدا ہوجاتی ہے اور سانس ہلکا اور لطیف ہوجاتا ہے۔ سانس میں لطافت آجانے سے جسم مثالی تجلی کی طرف صعود کرنا شروع کردیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہم سوجاتے ہیں تو ہمارا جسمانی نظام برقرار رہتا ہے لیکن ہمارا ذہنی تعلق گوشت پوست کے جسم سے عارضی

SOURCE OF INFORMATION



زندگی کا ہر تقاضہ ایک اطلاع ہے۔
اطلاع کا کوئی سورس ہے جہاں سے اطلاعات ایک تسلسل کے ساتھ ذہن میں وارد ہوتی رہتی ہیں۔
گوشت پوست کے جسم کے ساتھ پابند ہو کر عمل کرنا اطلاع کی نزولی حرکت ہے۔
گوشت پوست کے جسم سے آزاد ہو کر عمل درآمد کرنا صعودی حرکت ہے۔ اور یہ کیفیت رات کے حواس سے تعلق رکھتی ہے۔ اطلاع پر عمل درآمد ریکارڈ ہورہا ہے۔
تقاضوں کے نزول و صعود سے زندگی تعمیر ہوتی ہے۔
نزول و صعود کا یہ عمل ہر آن اور ہر لمحہ جاری و ساری ہے۔

طور پر منقطع ہوجاتا ہے۔ گوشت پوست کے جسم سے یہ عارضی لاتعلقی بیداری میں منتقل کردی جائے تو انسان ماورائی یا غیب کی دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے۔ غیب کی دنیا لطیف دنیا ہے۔ جس طرح انسان اس دنیا میں کام کرتا ہے، کھاتا پیتا ہے اسی طرح غیب کی لطیف اور نورانی دنیا میں بھی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے۔

مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں انسان عالم ظاہر کی طرح اپنے اندر موجود متحرک اور مسلسل عمل کرنے والی مخفی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔ جس طرح ہم خواب کی حالت میں جسم کے تقاضوں سے آزاد ہوکر اس دنیا میں سفر کرتے ہیں جس دنیا کو بیداری کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح مراقبے میں ہم اس دنیا کو دیکھتے ہیں جس دنیا کو ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم جب بیدار ہوتے ہیں، مرحلہ وار یہ دنیا ہمارے لئے ایک تجرباتی دنیا بن جاتی ہے۔ اسی طرح جب روحانیت کے طالب علم کی نظر اپنے باطنی وجود (Inner) میں کھلتی ہے تو عالم غیب میں بسنے والی دنیاؤں کے تجربات شروع ہوجاتے ہیں۔ جیسے جیسے غیب کی دنیا میں انہماک ہوتا ہے غیب میں بسنے والے افراد سے تعارف ہوتا رہتا ہے اور غیب کی دنیا کے شب و روز سے پوری واقفیت ہوجاتی ہے۔ غیب کی دنیا ہو یا مظاہراتی دنیا دونوں تجربات کے

مدار پر گھوم رہی ہیں۔ جس طرح پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ شعور حاصل ہوتا ہے اسی طرح غیب کی دنیا میں بھی ترقی پذیر شعور کارفرما ہے۔ مظاہراتی دنیا میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد پہلے ماں کی خوشبو کا احساس کرتا ہے۔ پھر وہ ماں کو پہچانتا ہے۔ اس کے بعد ماحول میں قریب رہنے والے افراد، ماں باپ بھائی بہن دادی نانی اور دادا نانا کو پہچانتا ہے۔ اس کے بعد قریبی رشتہ داروں سے مانوس ہوتا ہے پھر شعور میں اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے کہ دنیاوی علوم حاصل کر کے اپنا ایک مقام بنالیتا ہے اور دنیا میں اپنی انفرادی حیثیت میں زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح روحانیت کا طالب علم جب اپنے اندر موجود غیب کی دنیا سے متعارف ہوجاتا ہے تو اس کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ زمان کے دونوں کناروں کا احاطہ کرلیتا ہے۔ غیب کی دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھولیتا ہے۔ زمین سے باہر افراد کائنات سے ملاقات کرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، ستاروں میں گھومنا، افلاک کی سیر کرنا اس کے لئے شعوری زندگی بن جاتا ہے۔ روحانیت میں جو غیب مشاہدہ بن جاتا ہے وہ غیب نہیں رہتا شہود بن جاتا ہے۔ افلاک کے بے شمار نظاموں میں فرشتوں کی مخلوق اور اس مخلوق کی کارکردگی سے واقف ہوکر، فرشتوں سے ہم کلام ہونا آسان کام بن جاتا ہے۔ وہ دیکھ لیتا ہے کہ کائنات کی ساخت

میں کس قسم کی روشنیاں برسر عمل ہیں۔ ان روشنیوں کا Source کیا ہے؟ یہ روشنیاں کہاں اور کس طرح تخلیق ہورہی ہیں اور یہ روشنیاں افراد کائنات میں کس طرح تقسیم ہورہی ہیں اور روشنیوں کی مقداروں کے ردوبدل سے کائنات کے نقوش کس طرح بن رہے ہیں۔ تجلی نزول کرکے نور کیسے بنی اور نور نزول کرکے روشنی کس طرح بنا۔ نور اور روشنی کن قاعدوں اور کن ضابطوں پر قائم ہے۔

زندگی کی وہ حرکت جس میں گوشت پوست کی حرکت شامل ہے نزولی کیفیات پر مشتمل ہے اور وہ حرکت جو جسمانی خدوخال اور گوشت پوست سے مبرا ہوکر متحرک ہے، صعودی حرکت یا صعودی زندگی ہے۔ جب ہم زندگی کا اور زندگی میں کام کرنے والے ان تقاضوں کا تجزیہ کرتے ہیں جو گوشت کے جسم کے تابع ہیں، ہمیں لامحالہ اس طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے کہ زندگی کا کوئی تقاضہ ایسا نہیں ہے جو خیال کے بغیر پورا ہوتا ہو۔ خیال اور تقاضے کا تعلق اطلاع سے ہے اور وہ اطلاع کہیں سے آتی ہے اور دماغ کے اوپر وارد ہوتی رہتی ہے۔ دماغ اسے محسوس کرکے معنی پہناتا ہے اور جب اس اطلاع کی تکمیل ہوجاتی ہے تو یہی تکمیل جذبہ یا تقاضہ بن جاتی ہے۔ لامحالہ یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ زندگی کہیں سے آرہی ہے۔ جو زندگی کہیں سے آرہی

ہے وہ زندگی کہیں جا بھی رہی ہے اور زندگی کا یہ تسلسل اسی طرح قائم ہے کہ ایک ہی جذبہ باربار بیدار ہوتا ہے اور باربار وہ جذبہ کہیں غائب ہوجاتا ہے۔ پھر وہ جذبہ ابھرتا ہے اور جذبے کی تکمیل ہونے کے بعد ریکارڈ ہوجاتا ہے۔

مسافر شعور اور راستہ لاشعور ہے

تمام مخلوق ظہور میں آنے سے پہلے اللہ کے ارادے میں جس طرح محفوظ تھی اب بھی اسی طرح محفوظ ہے۔ جہاں یہ محفوظ ہے اس کو "لوح محفوظ" کہا جاتا ہے۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ سب دراصل لوح محفوظ کا عکس ہے۔ یعنی لوح محفوظ اصل ہے اور اس اصل کا عکس ساری کائنات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نوع کی شکل و صورت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ اربوں کھربوں سال گذرنے کے بعد بکری بکری، بندر بندر ہے، شیر شیر ہے، انسان انسان ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ یا حالات کی تبدیلی کی بنا پر انسان بکری بن جائے اور بکری انسان کا روپ دھارلے۔ بکری ہمیشہ بکری رہتی ہے۔ انسان ہمیشہ انسان رہتا ہے۔ بکری دراصل لوح محفوظ میں موجود بکری کا عکس ہے اسی طرح جنات، انسان، فرشتے سب چیزیں اپنی اپنی اصلوں پر قائم ہیں اور ہر نوع اپنی اصل کا عکس ہے۔

مثال :

ہم ایک فلم بناتے ہیں ایک فلم سے ایک ہزار فلمیں تیار ہوجاتی ہیں۔ جب ہم ایک ہزار فلموں کو الگ الگ پروجیکٹروں پر دیکھتے ہیں تو پھر فلم میں ایک ہی طرح کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ہر فلم الگ ہے۔ فلمیں ایک ہزار ہوں یا ایک لاکھ چونکہ ان کی اصل ایک ہے اور اصل میں تغیر نہیں ہوتا اس لئے ہر فلم کے مناظر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر فلم کی اصل میں ناک لمبی ہوجائے، کان بڑے ہوجائیں تو ہزاروں فلموں میں بھی ناک لمبی اور کان بڑے نظر آتے ہیں۔

قانون :

کسی چیز کو جاننے پہچاننے کا ذریعہ اسکا ہیولا اور مظاہراتی خدوخال ہوتے ہیں۔ اس مظاہراتی خدوخال کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے۔ جیسے چاند، سورج، ستارے، زمین، آسمان میں بسنے والی مخلوقات فرشتے، زمین کے اوپر بسنے والی مخلوق حیوانات، نباتات، جمادات، جنات زمین کے اندر بسنے والی مخلوق حشرات الارض وغیرہ۔

نام دراصل کسی شئے کا جسمانی مظاہرہ ہے۔ جب ہم چاند کہتے ہیں تو چاند کا نام ذہن میں آتے ہی ہمارے سامنے چاند کی شکل و صورت آجاتی ہے۔ ہم کسی انسان کا نام زید، بکر یا محمود رکھتے

ہیں۔ جب ہم زید کہتے ہیں تو دراصل ہم ان جسمانی خدوخال کا تذکرہ کرتے ہیں جو ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن جب ہم بات کو گہرائی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ نام یا علامت کے اوپر فنا واقع ہوجائے یا گوشت پوست کا جسم دنیا سے مخفی ہوجائے تو زندگی برقرار نہیں رہتی۔ باالفاظ دیگر ہم کسی چیز کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد اس شئے کا جسم ہوتا ہے۔ اس شئے کی زندگی یا روح نہیں ہوتی۔ نام یا جسم مفروضہ ہے۔ اس مفروضہ جسم میں دور کرنے والی زندگی حقیقت ہے۔ جب ہم قلم کہتے ہیں تو ہماری مراد قلم کی علامات نہیں ہوتیں۔ قلم دراصل اس حقیقت پر قائم ہے جو قلم کے مفہوم سے ہمارے ذہن کو مطلع کرتی ہے۔ مثلاً جب ہم قلم کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں قلم کا وصف آتا ہے۔ قلم کا وصف یہ ہے کہ قلم لکھنے کے کام آتا ہے۔ خیالات کو شکل و صورت دینے اور مفہوم کو تحریری شکل میں کاغذ پر منتقل کرنے والی چیز کا نام قلم ہے۔ قلم ایک جسم ہے۔ لیکن قلم کا وصف اس کی زندگی ہے۔ اسی طرح موجودات کے اندر جس قدر نوعیں ہیں ان نوعوں میں جس قدر افراد ہیں ان میں سے ہر فرد کا کوئی نہ کوئی نام ہے۔

کائنات کی تمام نوعوں کو یکجا کرنے اور نوعوں کے افراد کو

سمجھنے کے لئے ہر فرد کا نام ہم ذرہ رکھ لیں تو یہ ذرہ حرکت ہے۔ حرکت کا ایک رخ رنگین اور روشن ہے۔ رنگین اور روشن رخ مظہر یا جسم ہے۔ حرکت کا دوسرا رخ بے رنگ روشنی ہے جو دراصل زندگی، فطرت، کردار اور حقیقت ہے۔ فطرت کا ایک رخ زمان ہے اور دوسرا رخ مکان ہے۔ مکان مظہر، مفروضہ یا جسم ہے اور زمان حقیقت ہے۔

حرکت کا وہ رخ جو زمان ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا اور حرکت کا وہ رخ جو مکان ہے اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ جس رخ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہے وہ خالق سے ہم رشتہ ہے اور جس رخ میں تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے وہ مخلوق ہے۔

پارہ تیس میں سورۃ اخلاص تخلیقی قدروں کی تفسیر ہے۔ نظریہ رنگ و نور کی تشریحات ظاہر کرتی ہیں کہ مخلوق کی قدروں میں ردوبدل اور ٹوٹ پھوٹ واقع ہوتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس خالقیت تغیر و تبدل اور ٹوٹ پھوٹ سے ماوراء ہے۔

مثال :

ایک راستہ چلنے والا مسافر اپنے اندر کتنا ہی انہماک رکھتا ہو۔ تاہم وہ راستے کے بغیر اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ کتنا ہی بے نیاز ہوجائے، کتنا ہی بے خبر ہوجائے وہ اپنی ذات سے کتنا ہی غافل ہوجائے یہ ناممکن ہے کہ کوئی مسافر راستے سے لاتعلق

ہوجائے۔ مسافر اس وقت مسافر ہے جب وہ راستے پر چل رہا ہو۔ جب ہم مسافر کا نام لیتے ہیں تو ہمیں لامحالہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسافر اور راستے میں کمترین فاصلہ بھی نہیں ہوتا۔ مسافر کی تمام حرکات و سکنات، سارا کردار، زندگی کی طرزیں اور فکریں کسی بھی طرح راستے کی حدود سے باہر نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے راستے میں تغیر نہیں ہے اس کے برعکس مسافر کے لئے ہر قدم کے بعد دوسرے قدم میں تغیر ہے۔

نظریہ رنگ و نور کے اصول و ضوابط انسان کی رہنمائی کرتے ہیں کہ انسانی زندگی میں راستہ لاشعور اور مسافر شعور ہے۔ شعور میں انہماک جتنا زیادہ ہوجاتا ہے اسی مناسبت سے آدمی لاشعور سے دور ہوجاتا ہے۔ مسافر شعور اور راستہ لاشعور ہے کے مطابق جتنا زیادہ وقت لاشعور کو دیا جاتا ہے زندگی اسی مناسبت سے لاشعوری عمل کے راستے طے کرتی ہے اور جب فکر انسانی شعور قدروں سے ہٹ کر لاشعوری دنیا میں داخل ہوجاتی ہے تو شعور مغلوب اور لاشعور غالب ہوجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مادی دنیا میں شعور غالب اور لاشعور مغلوب ہے۔

روحانی ڈائجسٹ کراچی (پاکستان) اور روحانی ڈائجسٹ انٹرنیشنل (برطانیہ) میں نظریہ رنگ و نور پر مضامین شائع ہوئے تو جناب طاہر جلیل صاحب (گوجرانوالہ) نے لکھا :-

"کالم نظریہ رنگ و نور میں آپ نے لکھا کہ روح کے ساتھ ایک جسم مثالی یعنی روشنیوں کا جسم ہوتا ہے اور اس کی حرکت ہی سے اشیاء (انسانوں، حیوانوں وغیرہ) میں حرکت ہوتی ہے۔ موجودہ سائنس میں "Kirlian Photography" سے بھی یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ انسانوں، حیوانات اور نباتات کے جسم کے اوپر روشنیوں کا ہالہ ہوتا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ روحانی تشریح کے ساتھ اس تخلیقی Process پر روشنی ڈالیں کہ کس طرح اللہ کی ذات سے نور، روح بنتا ہے اور روح سے جسم مثالی بنتا ہے اور کس طرح جسم مثالی سے عالم ناسوت کی اشیاء وجود میں آتی ہیں"۔

جواب : اللہ چھپا ہوا خزانہ تھا اس نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، اس چاہت کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے محبت کے ساتھ تخلیق کا ایک پروگرام بنایا۔ کائنات سے متعلق جو کچھ اللہ کے ذہن میں نقش و نگار موجود تھے ان کو وجود بخشنے کے لئے اللہ نے فرمایا "کن"۔

اللہ کے ارادے میں جو کچھ تھا وہ "کن" کہنے سے تخلیق ہوگیا اور روحیں وجود میں آگئیں۔ کائنات کے تمام اجزاء اور ذرات کو شکل و صورت مل گئی۔ اس کے بعد اللہ نے موجودات کو مخاطب کیا۔

"الست بربکم" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟

روحوں نے کہا "بلی" جی ہاں آپ ہمارے رب ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سماعت اور بصارت کی منتقلی کے بعد روحوں کو اپنا ادراک ہوا اور انہوں نے خود کو خدوخال میں دیکھا اور محسوس کیا۔ روح تخلیقی پروسس کے تحت عالم لوح محفوظ اور عالم برزخ سے نزول کرتی ہوئی عالم ناسوت میں آگئی۔

باطنی نگاہ جب تخلیقی پروسس کو دیکھتی ہے تو وجود چھ غلافوں میں بند نظر آتا ہے۔ ان میں تین غلاف روشنیوں کے ہیں اور تین غلاف نور کے ہیں۔

ان کے نام یہ ہیں۔

1۔ روشنی مرکب

2۔ روشنی مفرد

3۔ روشنی مطلق

4۔ نور مرکب

5۔ نور مفرد

6۔ نور مطلق

ہر چیز اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اس کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو اللہ تھا۔ جب اللہ کو خیال آیا کہ میں پہچانا جاؤں تو اللہ نے کائنات کی تخلیق و تشکیل کا ایک

پروگرام بنایا۔ چنانچہ لبشکل کائنات اللہ کے ذہن میں جو کچھ موجود تھا اس نے پہلی کروٹ لی اور حرکت شروع ہوگئی۔

یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے (قیامت تک اور قیامت کے بعد ابدالاباد تک) جو پہلے سے وجود نہ رکھتی ہوں۔ جنت دوزخ قرون اولی، قرون وسطی اور قرون اخری بھی پہلے سے موجود ہیں۔ خالق کائنات اللہ کہتا ہے کہ :

"میں لوح محفوظ کا مالک ہوں جس حکم کو چاہوں برقرار رکھوں اور جس حکم کو چاہوں منسوخ کردوں۔ (ہر وعدہ ہے لکھا ہوا۔ مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور رکھتا ہے اس کے پاس ہے اصل کتاب) (سورة رعد)

لوح محفوظ کے نقوش عالم تخلیط کی حدود میں داخل ہوکر عنصریت کا لباس قبول کرلیتے ہیں۔ عنصریت کا لباس کو قبول کرتے ہی مکانیت کی بنیاد پڑجاتی ہے۔ مکانیت کا قیام زمانیت پر ہے۔

اسم ذات

کہکشانی نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے درپے جو خیالات ذہن میں آتے ہیں وہ دوسرے نظاموں اور آبادیوں سے ہمیں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ نور کی یہ لہریں ایک لمحہ میں روشنی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ روشنی کی یہ چھوٹی بڑی لہریں ہم تک بے شمار تصویر خانے لے کر آتی ہیں۔ ہم ان ہی تصویر خانوں کا نام واہمہ، خیال، تصور اور تفکر رکھ دیتے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

"لوگو! مجھے پکارو میں سنوں گا۔ مجھ سے مانگو میں دوں گا"

اللہ کا ہر اسم ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔ جو لوگ ان خزانوں سے واقف ہیں جب وہ اللہ کا نام ورد زبان کرتے ہیں تو ان کے اوپر رحمتوں اور برکتوں کی بارش برستی ہے۔ عام طور پر اللہ کے ننانوے نام مشہور ہیں۔ اس بیش بہا خزانے سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر نام کی تاثیر اور پڑھنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ کسی اسم کی بار بار تکرار سے دماغ اس اسم کی نورانیت سے معمور ہوجاتا ہے اور جیسے جیسے اللہ کے اسم کے انوار دماغ میں ذخیرہ ہوتے ہیں اسی مناسبت سے بگڑے ہوئے کام بنتے چلے جاتے ہیں

اور حسب دلخواہ نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن جس طرح اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی طرح گناہوں کی تاریکی انسان کے اندر روشنی کو دھندلا دیتی ہے۔ کوتاہیوں اور خطاؤں سے آدمی کثافتوں، اندھیروں اور تعفن سے قریب ہوجاتا ہے اور اللہ کے نور سے دور ہوجاتا ہے۔

اسم ذات کے علاوہ اللہ کا ہر اسم اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی ہر صفت فعال اور متحرک ہے۔ ہر صفت اپنے اندر طاقت اور زندگی رکھتی ہے۔ جب ہم کسی اسم کا ورد کرتے ہیں تو اس اسم کی طاقت اور تاثیر کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اگر مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوں تو یہ انسان کی اپنی کوتاہی اور پرخطا طرز عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

قانون :

جب ہم کسی شئے کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پہلے وہ شئے ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ پھر شئے کی اندر شعور اور فہم ابھرتا ہے جو شئے کے تعارف کا ذریعہ بنتا ہے۔ جب تک شئے مشاہدے میں داخل نہ ہو یا شئے کی فہم کی اطلاع روح سے شعور کو منتقل نہ ہو ہم کسی شئے کے بارے میں کوئی معانی متعین نہیں کرسکتے۔

ہم جب کسی چیز کا نام لیتے ہیں تو وہ سننے والے کی روح میں پہلے وارد ہوتی ہے۔ مثلاً جب سورج کہا جاتا ہے تو سننے والا اپنے

Inner میں سورج کو محسوس کرتا ہے اس کے بعد شعوری طور پر سورج کے معانی اور مفہوم متعین ہوتے ہیں۔ ہم روزانہ ظاہری آنکھ سے سورج کو دیکھتے ہیں وہ سورج داخل کے اندر موجود سورج سے مختلف ہے۔ نہ صرف یہ کہ مختلف ہے بلکہ جس طرح ہم سورج کو دیکھتے ہیں روحانی آنکھ سے جو سورج نظر آتا ہے وہ اس سورج کے برعکس ہے جو ہم دن میں سورج دیکھتے ہیں۔ مادی آنکھ کے ذریعے دیکھنے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ سورج کے اندر حرارت اور گرمی ہے۔ سورج کی حرارت، گرمی، رنگ اور شعاعوں کے ذریعے زمین کو حرارت اور گرمی پہنچ رہی ہے۔

روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے کہ سورج بہت زیادہ چمکدار سیاہ توے کی طرح ہے۔ روحانی آنکھ سے جو سورج نظر آتا ہے اس میں روشنی اور رنگ نہیں ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنے سیارہ کو دیکھتے ہیں تو سیارے کے اوپر یا سیارے میں موجود فضا میں جو روشنیاں ہیں ان روشنیوں کو سورج کی روشنیاں قرار دیتے ہیں جب کہ روحانی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ ہر سیارہ بذات خود ایک روشنی ہے۔ سورج کے اندر ظاہری آنکھ سے جو تیزی نظر آتی ہے وہ دراصل زمین یا کسی سیارے کا عکس (Reflection) ہے روحانی آنکھ جس طرح سورج کو دیکھتی ہے وہ ایسی حقیقت ہے جس میں تغیر نہیں ہے۔

اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن جب کوئی بندہ اللہ کا نام سنتا ہے تو اس کے داخل میں ایک حقیقت وارد ہوتی ہے۔ ایسی حقیقت جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایک آدمی اللہ کے وجود سے انکار کرتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انکار کس چیز کا کیا جارہا ہے؟ مفہوم یہ ہوا کہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جو انسان کے اندر داخل ہوتی ہے اور شعور اس حقیقت کا دباؤ بھی محسوس کرتا ہے۔ اس حقیقت کے معانی اور مفہوم اگر ذہن یا شعور کے اوپر پوری طرح واضح نہیں ہوتا تو وہ اللہ کا انکار کردیتا ہے۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ جس اللہ کا تذکرہ کیا جارہا ہے اس اللہ کو شعوری فہم تسلیم نہیں کرتی۔ روحانیت کے ماہرین نے نگاہ کی تین طرزیں قائم کی ہیں۔ یقین کا علم ہونا، یقین کو دیکھ لینا اور یقین کی حقیقت سے واقف ہونا۔

آئینے کی مثال سامنے رکھ کر تفکر کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ایک شخص آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے مگر آئینے کی صفات یا خصوصیات اس کے سامنے نہیں ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ مجھ جیسا ایک انسان میرے سامنے کھڑا ہے۔ اس یقین کی بنیاد پر وہ آئینے میں خود کو دیکھ رہا ہے۔ اس حالت کا نام یقین کا علم ہے۔ یعنی اس میں یہ علم داخل ہوگیا ہے کہ وہ آئینہ دیکھ رہا ہے۔ اگر دیکھنے والے کو یہ علم ہے کہ میں

آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں اور وہ آئینہ اور عکس کی حقیقت سے ناواقف ہے تو یہ علم، یقین کو دیکھ لینا ہے۔ اس کے برعکس اگر دیکھنے والا اپنی اور آئینے کی حقیقت جانتا ہے۔ یعنی وہ آئینے کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہے تو اس حالت کا نام یقین کی حقیقت سے واقف ہونا ہے۔

قانون :

ہر چیز اپنے اندر دوسری چیز کو جذب کررہی ہے اور جذب کرکے دوسرے کو دکھا رہی ہے۔ کائنات میں وہ افراد جو اپنی ذات میں دیکھتے ہیں ان کا مشاہدہ ہے کہ ہر چیز خود کچھ نہیں دیکھ رہی بلکہ کسی کے دیکھنے کو دیکھ رہی ہے۔ ساری کائنات ایک آئینہ ہے اور یہ آئینہ روشنی ہے۔ ایک روشنی ہے جو مختلف روپ بدل کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہورہی ہے اور ہر صورت میں روشنی کسی دوسری صورت کو دیکھ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے اوپر جب موت وارد ہوجاتی ہے اس کے باوجود کہ جسم کے تمام حصے آنکھیں، دماغ دوسرے اعضاء میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ وجہ یہی ہے کہ جو روشنی آئینے کا کام دے رہی تھی اس نے مادی جسم سے رشتہ منقطع کرلیا ہے۔

روحانیت کا لفظ جب زبان سے ادا ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم کسی ایسی طرز فکر کا تذکرہ کررہے ہیں جو

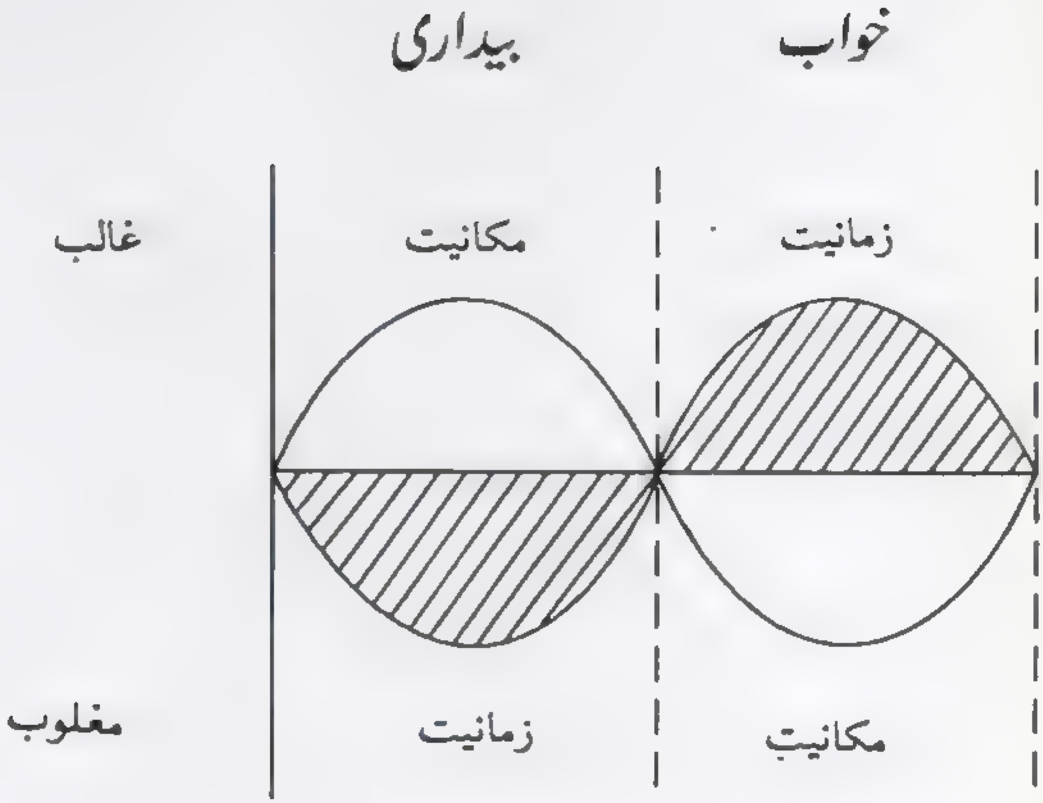
طرز فکر دنیا میں رائج تمام مادی علوم سے الگ ہے۔ ان علوم کا تعلق طبعیات سے ہو، نفسیات سے ہو یا مابعد النفسیات سے ہو۔ ہر علم ہمیں ایک روشنی دیتا ہے۔ شعوری طور پر جب ہم کچھ دیکھتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں مادی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں اور جب ہم روحانی آنکھ سے دیکھنے کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہماری آنکھ واسطہ بن رہی ہے اور ہم کسی چیز کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ جب ہم پانی کو دیکھتے ہیں تو فی الواقع ہم پانی کو نہیں دیکھتے بلکہ پانی کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔ یعنی پانی ہمیں دیکھتا ہے اور پانی اپنے دیکھنے کے عمل کو ہمیں منتقل کردیتا ہے اور ہم پانی کے دیکھنے کو دیکھ لیتے ہیں۔ براہ راست دیکھنے کی نظر کائناتی شعور ہے۔ کائناتی شعور یا کائناتی نظر جس مقام اور جس نقطہ پر جلوہ گر ہوتی ہے وہ ایک ہی طرز رکھتی ہے یہ بات ہر شخص جانتا ہے جس طرح ایک انسان پانی کو پانی دیکھتا ہے اسی طرح انسان کے علاوہ مخلوقات چرندے، پرندے اور درندے اور مخلوق کا ہر فرد پانی کو دیکھتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انسان نے پانی کو پانی دیکھا ہو اور شیر نے پانی کو دودھ دیکھا ہو۔ جس طرح انسان لوہے کو سخت محسوس کرتا ہے اسی طرح چیونٹی سے ہاتھی تک کی مخلوق کا ہر فرد لوہے کو سخت محسوس کرتا ہے۔ کائنات میں پھیلے ہوئے تمام مناظر اسی قانون

کے پابند ہیں۔ آدمی چاند کی طرف نظر اٹھا کر چاند کو جس شکل و صورت میں دیکھتا ہے، چکور بھی چاند کو اس صورت میں دیکھتا ہے۔ جس طرح ایک آدمی پانی پی کر آنتوں کی سیرابی کرتا ہے اسی طرح گائے بھینس ، بھیڑ بکریاں اور دوسرے جانور پانی پی کر اپنی جسمانی نشوو نما کرتے ہیں۔ درخت کی جڑیں بھی پانی کو پانی سمجھ کر پیتی ہیں۔ جس طرح انسان اور دوسرے جانور پانی سے نشوونما پاتے ہیں اسی طرح پھول بھی پانی سے اپنی نشوونما کرتے ہیں۔ جس طرح ایک سانپ دودھ کو دودھ سمجھ کر پیتا ہے اسی طرح بکری بھی دودھ کو دودھ سمجھ کر پیتی ہے۔ یہ ایک مشترک نگاہ ہے جو ساری کائنات اور کائنات کے تمام افراد میں یکساں طور پر کام کررہی ہے۔ ان تمام مثالوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات کے اندر جتنی نوعیں ہیں اور مخلوقات ہیں، نوعوں کے افراد ہیں ان سب میں نظر کا ایک ہی قانون کارفرما ہے۔

کائنات ایک کنبہ ہے

عالمین کے تین رخ ہیں۔ ایک رخ نورانی عالم ہے۔ دوسرا رخ روشنی کا عالم ہے۔ تیسرا رخ تخلیط یا عالم ناسوت کا عالم ہے۔ نور کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد ہمارے اوپر مشیئت کا انکشاف ہوتا ہے۔ مشیئت میں داخل ہوکر اللہ کی ذات کا انکشاف ہوتا ہے۔

عالم ناسوت میں روح حیوانی کا عارف ورود، غنود یا مراقبہ میں یہ دیکھ لیتا ہے کہ روح حیوانی مکانیت میں بند ایک رخ ہے اور انسان پابند حواس میں قید ہے۔ روح حیوانی سے نکل کر جب انسان روح انسانی میں داخل ہوتا ہے تو یہ دیکھ لیتا ہے، سن لیتا ہے اور محسوس کرلیتا ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی صلاحیت موجود ہے جس کو استعمال کرکے وہ مکانیت سے آزاد ہوسکتا ہے۔ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ انسان محض مکانیت کے خدوخال پر قائم نہیں ہے بلکہ ان خدوخال پر روشنیوں کا ایک غلاف چڑھا ہوا ہے اور جسمانی وجود روشنی کے تانے بانے پر بنا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی علم ہوجاتا ہے کہ انسان کی رفتار سفر اور رفتار پرواز روشنی کی رفتار کے برابر ہے۔



خواب
بیداری
زمانیت
مکانیت
غالب
مکانیت
زمانیت
مغلوب

دونوں رخ الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

ورق کے دو صفحات کی طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

مکانیت، زمانیت کی بساط پر قائم ہے۔

عالم بیداری میں زمانیت پس پردہ ہوتی ہے جب کہ مکانیت غالب ہوتی ہے۔

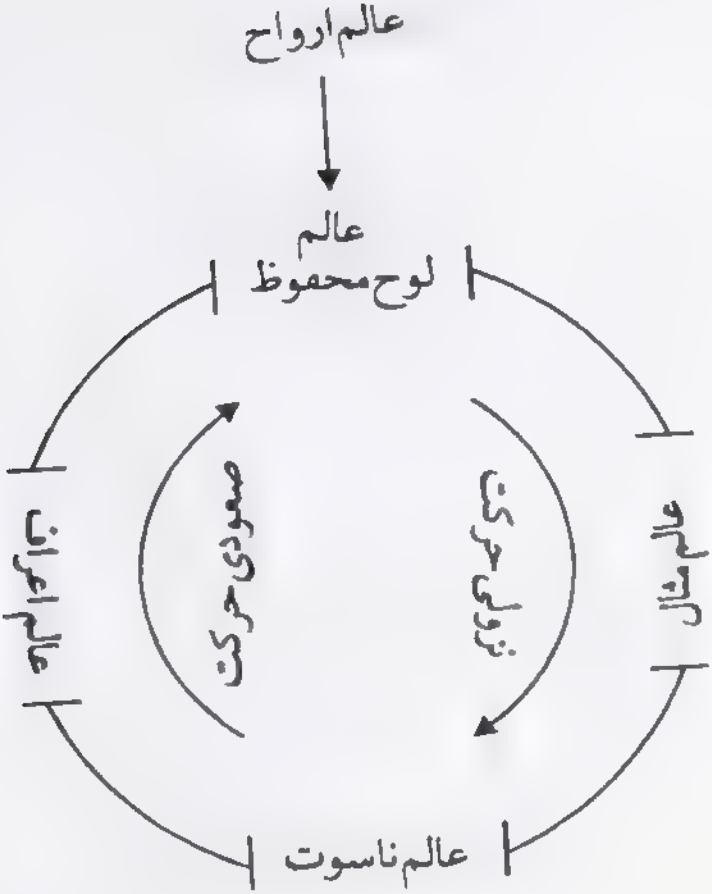
عالم خواب میں مکانیت، زمانیت میں پیوست اور مغلوب ہو جاتی ہے۔

کائناتی فارمولوں کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ جب کائنات میں خدوخال ظاہر ہوتے ہیں تو زمان پردے میں چلا جاتا ہے اور جب کائنات کے اندر موجودات کی تصویریں خدوخال سے ماوراء ہوجاتی ہیں تو مکان، زمان میں پیوست ہوجاتا ہے۔ کائنات زمانیت میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے نزولی حرکت کہا جاتا ہے اور جب مکانیت پس منظر میں چلی جاتی ہے تو اسے صعودی حرکت کہا جاتا ہے۔ نزول و صعود کا پورا سلسلہ لوح محفوظ پر نقش ہے۔ لوح محفوظ اور عالم ناسوت کے درمیان ایک پردہ ہے۔ نزولی حرکت میں عالم ناسوت اور لوح محفوظ کے درمیا جو پردہ Screen واقع ہے اس کو برزخ کہا جاتا ہے۔ لوح محفوظ سے چلنے والی تصویریں جب عالم ناسوت میں خدوخال کے ساتھ مظہر بنتی ہیں اور مظہر بن کر لوح محفوظ کی طرف صعود کرتی ہیں تب بھی لوح محفوظ اور عالم ناسوت کے درمیان ایک پردہ Screen ہے۔ جسے اعرف کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اللہ بصیر ہے، خبیر ہے، علیم ہے، محبت کرنے والا ہے، اللہ کا ذہن بھی ہے۔ خالق کائنات کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اپنے تعارف کے لئے ایسی تخلیق عمل میں لائے جس تخلیق میں حافظہ بھی ہو، فکر بھی ہو، بصیرت بھی ہو، علوم سیکھنے کی تمام تر

صلاحیتیں بھی موجود ہوں۔ تاکہ مخلوق اپنے خالق کو پہچان لے۔ تمثیلاً ہم اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں اللہ ایک ذات ہے اس کے ذہن میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ایسی کائنات بنانی چاہیئے جو مکمل ہو اور اس کائنات کے افراد میں ایسے منتخب افراد ہوں جو مجھے پہچان سکیں اور ان افراد کا میرے ساتھ تعلق بھی قائم ہو۔ جب اللہ نے ارادہ کیا تو اللہ کے ذہن میں جو کچھ جس طرح موجود تھا عمل میں آگیا۔ پروگرام کا پہلا مرحلہ عالم ارواح عمل میں آیا۔ عالم ارواح کے بعد دوسرا عالم "لوح محفوظ" وجود میں آیا۔ لوح محفوظ پر کائنات کی ہر حرکت، کائنات کا ہر ہر لمحہ اور کائنات کے اندر جتنی نوعیں ہیں اس نوع کے ہر ہر فرد کی اجتماعی فلم بن گئی۔ پھر اس پروگرام کو حرکت کے ساتھ مظاہراتی شکل و صورت دے دی گئی۔ جس عالم میں کائنات نے نوعی اعتبار سے مظاہراتی خدوخال اختیار کئے یعنی فلم کا یکجائی پروگرام نوعی اعتبار سے الگ الگ ہوا۔ اس عالم کو عالم مثال یا برزخ کہتے ہیں۔ عالم مثال کی فلم جب انفرادی صورت میں ظاہر ہوئی اور جہاں نوعی پروگرام انفرادی صورت میں نشر ہورہا ہے یہ عالم "عالم ناسوت" ہے۔

نزول و صعود


عالم ارواح
عالم
لوح محفوظ
عالم مثال
نزولی حرکت
صعودی حرکت
عالم اعراف
عالم ناسوت

ارادہ الہیہ "کن" سے خالق کائنات کے ذہن میں جو کچھ جس طرح موجود تھا وجود میں آگیا ________ عالم ارواح

کائنات میں حرکت کی یہ طرز متعین ہوئی کہ انواع اور ہر نوع کے افراد کی اجتماعی فلم بن گئی ________ لوح محفوظ۔

اگلے مرحلے میں یکجائی پروگرام

حرکت کے اگلے مرحلہ میں یکجائی پروگرام نوعی اعتبار سے الگ الگ ہو گیا۔ عالم مثال / عالم برزخ۔

عالم مثال کی فلم انفرادی صورت میں زمین کی اسکرین پر نقش ہو رہی ہے۔ عالم ناسوت

عالم ناسوت شعوری دنیا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کے عالمین لاشعوری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

عالم ناسوت نزولی حرکت کی انتہاء ہے۔ یہاں سے نزولی حرکت صعودی حرکت میں بدل جاتی ہے......عالم اعراف

تشریح :

ہر شئے اگر ایک طرف نزول کررہی ہے تو دوسری طرف صعود کررہی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کی ہر شئے لامحدودیت میں آکر اس بات کا تعارف کراتی ہے کہ اللہ کی ذات غیر محدود ہے۔ لامحدودیت اللہ کی ذات ہے اور محدودیت مخلوق ہے۔ مخلوق یا محدودیت ہی دراصل کائنات ہے۔ کائنات تین دائروں پر مشتمل ہے۔

کائنات کا پہلا دائرہ "مادیت" ہے۔

کائنات کا دوسرا دائرہ "حیوانیت" ہے۔

کائنات کا تیسرا دائرہ "انسانیت" ہے۔

خارجی دنیا اور خارجی دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان کی حرکات و سکنات ایک میکانیکی عمل کے تحت جاری و ساری ہیں اور اس Mechanism کی بنیاد مادیت ہے۔ مادیت جس میکانیزم پر جاری ہے اس میکانیزم کے نتیجے میں جمادات، نباتات بنتے ہیں۔ دوسرے محدود دائرے سے حیوانات بشمول انسان کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ کائنات کے تین دائرے نزول سے صعود اور صعود سے نزول میں رد و بدل ہورہے ہیں۔ ہر دائرہ تحلیل ہوکر دوسرا دائرہ بن رہا ہے۔

بندہ جب اللہ سے متعارف ہوتا ہے تو متعارف ہونے کی دو

طرزیں قائم ہیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ وہ اللہ کی صفات سے متعارف ہوتا ہے۔ دوسری طرز یہ ہے کہ وہ ذات سے متعارف ہوتا ہے۔ جب کوئی بندہ صفات سے متعارف ہوتا ہے تو ہو اللہ کو اللہ کی صفات میں دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی بندہ اللہ کو اللہ کی ذات میں دیکھتا ہے تو دراصل وہ محض اپنی فکر وجدانی سے اللہ کی قربت کو محسوس کرتا ہے۔

کائنات کی ساخت اور اس ساخت میں مختلف مقداریں اور ان مقداروں سے ترتیب پاکر مختلف نوعیں اور ہر نوع میں مخصوص خدوخال، مخصوص صفات اور پھر ایک نوع سے دوسری نوع کا علمی اور صفاتی اشتراک ہر نوع کے الگ الگ افراد اور افراد کا آپس میں رشتہ، ایک نوع کے افراد کا دوسری نوع کے افراد سے باہمی رشتہ ہر ذی عقل اور ذی فہم آدمی کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ کائنات ایک کنبہ ہے اور اس کنبہ کا کوئی سرپرست اعلی ہے وہ کائنات میں کوئی بھی نوع ہو یا کسی بھی نوع کا کوئی بھی فرد ہو وہ پوری کائنات سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتا۔ وہ کائنات میں موجود نوعوں یا اجرام سماوی کے علوم سے واقفیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن باہمی اور مخفی رشتہ ہر حال میں قائم ہے۔

خلاء

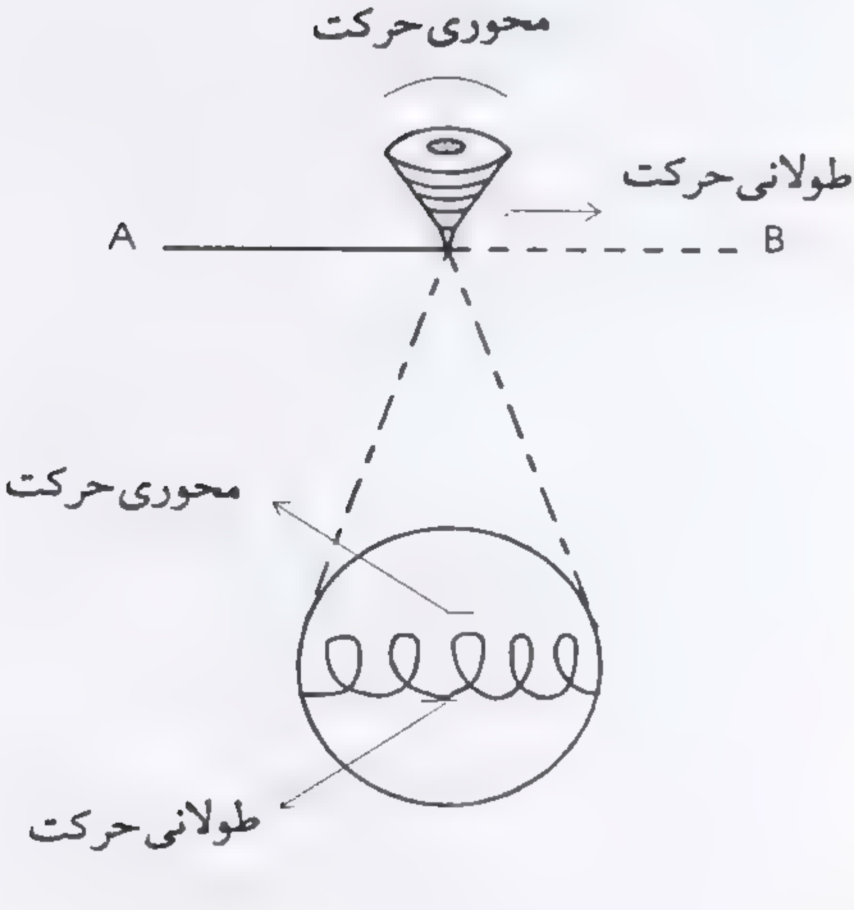
کائنات کے کسی فرد کی تخلیق پر غور کیا جائے اور تخلیقی فارمولے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کائنات اور افراد کائنات کی چار سطحیں متعین ہوتی ہیں کائنات کی پہلی سطح ورائے لاشعور ہے۔ یہ سطح کائنات یا افراد کائنات کے اندر بہت گہرائی میں واقع ہے۔ اس سطح میں اتنی زیادہ گہرائی ہے کہ اس سطح کے بارے میں اس سطح کے اوصاف کی تشریح کے بارے میں علم حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن روحانی لوگوں میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں (ان کی تعداد کم ہی سہی) کہ اس سطح کی گہرائی میں اوصاف ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ وہی لوگ اس سطح کی صفات کو جان لیتے ہیں تو جو براہ راست مشیئت کے تابع ہوتے ہیں۔

پہلی سطح کے بعد دوسری سطح آتی ہے۔ پہلی سطح جب نزول کے ساتھ ابھرتی ہے تو نزولی حرکت نئے اوصاف کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ اس مجموعے کا نام لاشعور ہے۔ اس سطح کے اوصاف کی تشخیص بھی مشکل ہے لیکن پہلی سطح کے اوصاف کی تشخیص کے مقابلے میں آسان ہے۔ لاشعور میں جب حرکت واقع ہوتی

ہے تو فرد کا شعور اس کا احاطہ کرلیتا ہے اور اسی احاطہ کا نام تصور ہے اور جب تصور اپنی سطح سے ابھر کر فرد کے سامنے آتا ہے تو اس کو ہم فرد کا شعور کہتے ہیں اور فرد کاشعور اپنی بالمقابل چیزوں کا عکس قبول کرنے لگتا ہے۔ یہی حالت شئے کو وجود بخشتی ہے اور کسی وجود کو مختلف نام دے دیئے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کائنات کے ہر فرد کو چار سطحوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جب تک کوئی فرد یا کوئی شئے ان چار سطحوں سے نہ گذرے اس وقت تک اس شئے کی موجودگی زیر بحث نہیں آتی۔

پہلے تین مرحلوں میں شئے کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور چوتھے مرحلے میں شئے خدوخال کے ساتھ موجود کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ شئے کی حرکت یا کائنات کی حرکت دو طرح واقع ہوتی ہے۔ ایک حرکت کو طولانی حرکت کہا جاتا ہے اور دوسری حرکت محوری حرکت ہے۔ طولانی حرکت ہو یا محوری حرکت دونوں میں ایک وقفہ ہوتا ہے لیکن طولانی حرکت بجائے خود ایک وقفہ ہے۔ مذکورہ چار شعور جب طولانی سمت میں دور کرتے ہیں اس دور کا نام وقفہ، ٹائم یا زمان ہے لیکن جب چاروں شعور محوری سفر میں اپنے مرکز کی طرف دور کرتے ہیں تو اس دور کو مکان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

محوری اور طولانی گردش



طولانی اور محوری گردش دونوں مل کر زمانیت اور مکانیت کی تخلیق کرتی ہیں۔

نقطہ A تا نقطہ B ایک فاصلہ (مکانیت) ہے۔

لٹو، AB فاصلہ طولانی گردش میں آگے بڑھتے ہوئے طے کرتا ہے۔

طولانی گردش میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ

لٹو دائروں کی شکل میں محوری گردش کرتا ہے جو مکانیت ہے۔

قانون :

طولانی حرکت، محوری حرکت، مکان و زمان کی دونوں حالتیں طولانی سمت میں اور محوری سمت میں ایک ساتھ گردش کرتی ہیں۔ یہ دونوں گردشیں مل کر شعور کے اندر مسلسل تخلیق کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً ڈوری میں باندھ کر لٹو کو پھینکا جاتا ہے۔ تو لٹو گھومتا ہے۔ لٹو کا گھومنا زمانی اور مکانی دونوں طرح ہوتا ہے۔ لٹو محوری گردش میں گھومتا ہے۔ طولانی گردش میں آگے بڑھتا ہے۔ آگے بڑھنا زمانیت ہے اور محوری گردش میں اپنے مرکز میں دائروں میں گھومنا مکانیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ طولانی اور محوری گردش دونوں مل کر زمانیت اور مکانیت کی تخلیق کرتی ہیں۔ ہم طولانی گردش کو اپنے حواس میں سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، ماہ و سال اور صدیوں کی شکل میں جانتے ہیں اور شمار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی طولانی گردش کو اپنے حواس میں منٹ یا مکانیت کا وقفہ شمار کرتے ہیں مثلاً جب ہماری نظر آسمان پر اٹھتی ہے تو ہمارے حواس میں سیکنڈ، منٹ کے وقفے ٹوٹ جاتے ہیں۔ جبکہ ہمارا شعوری تجربہ ہے کہ ہم چند سو قدم سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، ارکھوں میل ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ چاند، سورج، ستاروں اور اجرام فلکی کو دیکھنا اس لئے ممکن ہے کہ ہم طولانی گردش کے ساتھ محوری گردش

میں بھی سفر کررہے ہیں۔

واہمہ، خیال، تصور، یہ تینوں حالتیں طولانی گردش کی ایک ہی سمت واقع ہوتی ہیں اور محسوساتی حالت محوری گردش میں واقع ہے۔ محسوسات میں زمانی مکانی دونوں تغیر ایک ہی نقطہ میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی نقطہ کا نام وقفہ ہے۔ وقفے کا سلسلہ ازل سے ابد تک جاری وساری ہے۔ مذکورہ بالا چار سطحوں یا چار شعوروں کی مرکزیتیں الگ الگ چار زندگیاں رکھتی ہیں۔

1۔ ورائے بے رنگ

2۔ بے رنگ

3۔ یک رنگ

4۔ کل رنگ

چار شعوروں کی علیحدہ علیحدہ مرکزیت ایک مکمل زندگی یا مکمل حرکت ہے۔ شعور کا ایک کردار غیر متغیر ہے۔ یہ کردار اپنی حدوں میں ایک ہی طرز پر دیکھتا، سوچتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس کردار میں کسی کائناتی ذرہ یا فرد کے لئے کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ یہ شعور ہر ذرہ میں ایک ہی زاویہ رکھتا ہے۔ اس میں لامکانی شعور سے دوسرا شعور تخلیق پاتا ہے۔ لامکانی شعور کی رفتار خیال سے کروڑوں گنا زیادہ ہوتی ہے۔ لامکانی شعور کی دوسری حرکت تخلیق ہے۔ لاشعور اور لامکانی شعور کی تیسری حرکت شعور

کی سطح پر وارد ہوتی ہے تو اس کی رفتار بہت کم ہوجاتی ہے لیکن یہ رفتار بھی روشنی کی رفتار سے لاکھوں گنا زیادہ ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار دوسو بیاسی میل فی سیکنڈ بتائی جاتی ہے۔ روشنی کی رفتار سے متحرک لامکانی شعور کی تیسری حرکت جب نزول کر کے شعور کے اندر داخل ہوتی ہے تو "عالم ناسوت" بن جاتا ہے۔ عالم ناسوت میں داخل ہونے کے بعد روشنی میں عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ عناصر کی تخلیق اور آمیزش دراصل فرد کا چوتھا شعور ہے۔ اس شعور کا ادراک سطحی ہوتا ہے اس لئے اس کا ٹھراؤ اور ٹھوس پن بہت کم وقفے پر مشتمل ہے۔ چونکہ ٹھوس پن بہت کم وقفے پر مشتمل ہے اس لئے یہ شعور سب سے زیادہ ناقص ہے ناقص ہونے کی وجہ سے اس میں پیہم اور مسلسل خلاء واقع ہوتا رہتا ہے۔

قانون :

جو چیز جتنی ٹھوس ہوگی اسی مناسبت سے اس میں خلاء ہوگا۔ روحانی آنکھ سے اگر دیوار کو دیکھا جائے تو ہر اینٹ کے اندر بڑے بڑے سوراخ نظر آتے ہیں پہاڑوں کو اگر باطنی آنکھ سے دیکھا جائے تو بڑے بڑے غار نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے بادلوں کی طرح کوئی چیز آسمان میں تیر رہی ہے۔ خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے ان حواس میں ایسے تقاضے بھی موجود ہیں جن کو ہم اختیاری

حواس کہہ سکتے ہیں یعنی ایسے حواس جو ہمیں زندگی کے تعمیری رخ پر قائم رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان خلاؤں میں جو رخ تعمیر کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کا نام ضمیر ہے۔

انسان حیوان سے کیوں ممتاز ہے

دنیا میں ہزاروں انسان بستے ہیں ہر انسان دوسرے کی زندگی سے ناواقف ہے۔ ہر انسان کی زندگی ایک ایسا راز ہے جس کو دوسرے نہیں جانتے اس راز کی بدولت ہر انسان اپنی غلطیوں کو چھپائے ہوئے خود کو بہتر پیش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور خود کو مثالی بنا کر دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی غلطیاں لوگوں کے سامنے ہوتیں تو پھر وہ خود کو بہتر ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتا اور زندگی کا ارتقاء بھی عمل میں نہیں آتا۔ انسانی ساخت کی یہی خصوصیت اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر ایک حیوان کے اعمال متعین ہیں۔ حیوان کے متعین اعمال کو ہر حیوان کا شعور پوری طرح جانتا ہے چونکہ جانوروں میں انفرادی طور پر ایک دوسرے کے درمیان پردہ حائل نہیں ہے اور ہر حیوان دوسرے حیوان کی زندگی سے پوری طرح واقف ہے اسلئے کوئی حیوان خود کو دوسرے حیوان کے سامنے مثالی بنا کر پیش نہیں کرتا۔

قانون :

خود کو چھپانا اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کا جذبہ ہی انسان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انسانی ساخت کا شعوری امتیاز ہی تمام علوم و فنون کا مخزن ہے۔ انسان کی یہ کوشش کہ وہ خود کو دوسروں کے سامنے مثالی بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نئے راستوں کی تلاش کی طرف مائل کرتی ہے۔ نئے نئے راستوں کی تلاش اور نئی نئی ایجادات کی کوشش ہی دراصل انسانی ارتقاء کا راز ہے۔ یہی شعور انسان کو کائنات کی دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ ایسی کوشش اور جدو جہد ہے جس جد و جہد اور کوشش سے وہ علوم حصولی سے گذر کر ماورائی عالمین میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہی کوشش اور جستجو ہے جو نئے نئے راستوں کو تلاش کرتی ہے، نئے نئے علوم کی داغ بیل ڈالتی ہے۔ نئے نئے فلسفوں کو قائم کرتی ہے اور نئے نئے فلسفوں سے بے شمار علوم کی شاخیں مرتب کرتی ہے۔ یہ سب ارتقائی عمل ہیں۔ ارتقائی عمل ہی علم حصولی کا ذریعہ ہے۔ لیکن علم حصولی کے تحت جتنی بھی اختراعات ہوتی ہیں وہ مفروضات اور قیاسات پر مبنی ہیں۔

سادھو کبیر داس کہتے ہیں

رنگی کو کہیں نارنگی، تنت مال کو کھویا
چلتی کو کہیں گاڑی، دیکھ کبیر رویا

نارنگی پھل کا چھلکا، پھانک، پھانک کے اندر گودا، گودے کے اندر بیج، بیج کے اندر گری ہر چیز کا رنگ مختلف ہے۔ لیکن دنیا والے اسے نارنگی سے موسوم کرتے ہیں۔ دودھ سے حاصل شدہ جوہر کو کھویا یعنی ''کھودیا'' کہا جاتا ہے۔ بھگت کبیر کہتے ہیں یہ کیسی اندھیر نگری ہے جہاں ہر چیز کو وہ نام دے دیا گیا ہے جو وہ نہیں ہے۔

جب ہم انسانی زندگی کی ساخت اور ارتقاء کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہیں اور کائناتی نظام میں زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی سے ناواقف ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ میری زندگی کے بارے میں میرے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں جانتا۔ انسانی زندگی کا یہی چھپا ہوا رخ انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ یعنی انسان حیوانات سے اس لئے ممتاز ہے کہ حیوانات میں اخفاء نہیں ہے۔

اس پوری وضاحت سے یہ نتیجہ مرتب ہوا کہ انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو چھپاتا اور اچھائیوں کو بیان کرتا ہے۔ انسانی ساخت کا یہ شعوری امتیاز ہی دراصل اس کو علوم و فنون کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

کائنات کی رفتار

روحانی طالبات اور طلباء یہ قانون جانتے ہیں کہ کائنات اور یہ ساری دنیا حواس کے اوپر قائم ہے۔ حواس میں دو رخ ہوتے ہیں۔

1۔ وہ حواس جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے جیسے جیسے تغیر واقع ہوتا ہے اسی مناسبت سے رنگ پیدا ہوتے ہیں۔

2۔ وہ حواس جن میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ جہاں تغیر نہیں ہوتا وہاں بے رنگی ہوتی ہے۔

حواس میں تغیر ورائے بے رنگ سے ہوتا ہے۔ ورائے بے رنگ میں تغیر سے ایک ایسی رنگینی پیدا ہوتی ہے جو بے رنگی کہلاتی ہے۔ بے رنگی میں تغیر پیدا ہوتا ہے تو حواس میں ایک ایک رنگ پیدا ہوجاتا ہے اور یہ بہت سارے رنگ جمع ہوکر کائنات بن جاتے ہیں۔

واہمہ سے تغیر کی شروعات ہوتی ہیں۔ یہ تغیر خیال اور تصور کی راہیں طے کرکے محسوس بن جاتا ہے۔ خیال، تصور اور محسوسات ایک دائرے میں سفر کرتے ہیں جس طرح خیالات اور تصورات محسوسات بننے کے لئے سفر کرتے ہیں اسی طرح یہ دوبارہ پلٹتے ہیں۔ خیال، تصور اور احساس جن مراحل سے گذر کر کسی

مقام پر ٹھرتے ہیں اس مقام کو سمجھنے اور اس مقام کا مشاہدہ کرنے کے لئے ہمیں تین شعوروں سے گذرنا پڑتا ہے اور تین شعوروں سے گذر کر جس مقام پر غیر متغیر مقام آتا ہے نظریہ رنگ و نور کے پیروکار اس مقام کو لاشعور کا نام دیتے ہیں۔

ہم جب مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور علم نبوت میں غور و فکر کرتے ہیں تو آسمانی کتابیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں کہ ان شعوروں کے علاوہ شعور اول اور شعور دوئم بھی ہیں۔ الفاظ کی کمی کے باعث ہم ان دونوں شعوروں کو لاشعور ہی شمار کریں گے۔ یعنی ایک وہ شعور جو عوام سے متعارف ہے، ایک وہ شعور جو کسی حد تک مفکرین اور سائنسدانوں سے متعارف ہے اور وہ شعور جو صرف علم نبوت سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ ہم جب کائنات کی ساخت میں تفکر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کی ساخت میں ایک شعور اور تین لاشعور پائے جاتے ہیں۔ اس کی Equation اس طرح ہے۔

پہلا شعور -------- شعور اول

دوسرا شعور -------- شعور دوئم

تیسرا شعور -------- شعور سوئم

چوتھا شعور -------- شعور چہارم

ان چاروں شعوروں میں سے شعور اول کی حیثیت لامکان کی

ہے اور باقی تین شعور مکان ہیں۔ یہ تینوں شعور اس لئے مکان ہیں کہ ان میں تغیر پایا جاتا ہے اور پہلا ایک شعور چونکہ تغیر سے آزاد ہے اس لئے یہ لامکان ہے۔

مکانیت، لامکانیت کا سفر کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں کائنات کے اندر موجود محوری گردش کو سمجھنا پڑے گا۔ اس کے بعد طولانی گردش کو۔

مثال :

ہم گلاس دیکھتے ہیں یا گلاس پر نظر پڑتی ہے تو گلاس کو پہچاننے کے لئے ہمیں نزول و صعود کے چھ دائروں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے ہمارے اندر گلاس کا 1۔ واہمہ پیدا ہوتا ہے واہمہ میں جب گہرائی پیدا ہوتی ہے تو 2۔ خیال بن جاتا ہے یعنی ہم جب گلاس دیکھتے ہیں تو پہلے گلاس کا ایک ہیولیٰ ہمارے ذہن میں وارد ہوتا ہے جس ہیولی میں نقش و نگار نہیں ہوتے لیکن نقش و نگار کا عکس ذہن پر پڑتا ہے۔ ایسا عکس جس کو دیکھ کر گلاس کو محسوس کرسکتے ہیں لیکن دیکھ نہیں سکتے۔ پھر یہی خیال اور گہرا ہوتا ہے تو 3۔ تصور کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور جیسے ہی تصور کی شکل اختیار کرتا ہے 4۔ احساس کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ فوراً ہی احساس 5۔ تصور میں تصور 6۔ خیال میں منتقل ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک وقت گلاس کو دیکھتے ہیں دوسرے

وقت گلاس نہیں ہوتا یعنی ہم نے جب گلاس کو دیکھا پہلے ہمارے ذہن پر واہمہ وارد ہوا۔ ایسا واہمہ جس کو ہم الفاظ میں بیان نہیں کرسکتے۔ خیال میں ایک شکل و صورت آئی۔ اس شکل و صورت نے جب گہرائی اختیار کی تو تصور بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مادی گلاس کے نہ ہونے کے باوجود گلاس کو دیکھ رہے ہیں اور جب یہ تصور گہرا ہوجاتا ہے تو ہمارے اندر گلاس کو دیکھنے کا احساس پیدا ہوجاتا ہے اور ہم گلاس کو دیکھ لیتے ہیں اور چھولیتے ہیں۔

یہ بات بہت غور طلب ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ محوری اور طولانی گردش میں سفر کررہا ہے۔ محوری گردش کا مطلب یہ ہے کہ حرکت کا ایک نقطہ سے شروع ہوکر اسی نقطہ پر ختم ہونا، محوری گردش کا یہ قانون ہی دراصل پوری کائنات کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ نزول و صعود کا یہ عمل ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں واقع ہوتا ہے اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دوبارہ پلٹ جاتا ہے اور بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ بار بار اس کا اعادہ جس رفتار سے ہوتا ہے وہ رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ ہم ہر ایک چیز کو اپنے سامنے ساکت محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ کائنات میں کوئی شئے ساکت نہیں ہے۔ کائنات میں اگر کوئی شئے ساکت ہوجائے تو پوری کائنات فنا ہوجائے گی۔ بات

صرف اتنی ہے کہ کائنات کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہم اسے ساکت محسوس کرتے ہیں۔

انسان دو شعوروں سے مرکب ہے۔ ایک شعور سے عامۃ الناس واقف ہیں اور دوسرے شعور سے عامۃ الناس واقف نہیں ہیں۔ جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں وہ واقف ہیں۔ واقف کاروں نے دو شعوروں کو الگ الگ کرنے کے لئے ایک شعور کا نام لاشعور رکھ دیا ہے یعنی ایسا شعور جو عامۃ الناس کے شعور سے ماوراء ہے۔ اس شعور اور لاشعور میں وہ تمام علوم آجاتے ہیں جن پر ایجادات ہورہی ہیں۔ آج کا سائنسدان انسان کے اندر موجود دوسرے شعور یعنی لاشعور سے واقف ہوگیا ہے۔ جب اس نے لاشعور کے اندر رہتے ہوئے تحقیق و جستجو کی اور کسی شئے کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کی تو نتیجے میں ایجادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب ہم عام دنیا سے ہٹ کر آسمانی علوم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جب ہم آسمانی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں تفکر کرتے ہیں تو تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے علم اکتسابی سیکھا ہی نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ انہوں نے عامۃ الناس کے شعور میں رہتے ہوئے کوئی علم نہیں سیکھا کوئی استاد نہیں بنایا لیکن اس کے

باوجود وہ نوع انسان کے لئے علوم کا سمند چھوڑ گئے۔

علمی ترقی اور نئی نئی ایجادات میں تفکر طلب بات یہ ہے کہ کوئی بھی ترقی کوئی بھی ایجاد دنیا میں موجود وسائل سے باہر نہیں ہے۔ وسائل ہونگے تو ایجاد ہوگی۔ وسائل نہیں ہونگے تو ایجاد اور ترقی نہیں ہوگی۔ کوئی بھی ایجاد وسائل کی محتاج ہے۔ یعنی دوسرا شعور (لاشعور) قدم قدم پر وسائل کا محتاج ہے۔ تیسرے لاشعور میں ہمارے سامنے انبیاء کی ذات آتی ہے ان ایجادات میں وسائل زیر بحث نہیں آتے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ اندھوں کو بینائی عطا کردیتے تھے۔ گنجوں کے سر پر بال آجاتے تھے اور ہاتھ پھیرنے سے کوڑھ ختم ہوجاتا تھا۔ یہ ایسا علم ہے جسے ایجاد یا ترقی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس علم کو معجزہ کہتے ہیں۔ ترقی میں وسائل زیر بحث آتے ہیں۔ معجزے میں وسائل زیر بحث نہیں آتے۔

سیاہ تختہ

زندگی کا قانون اور زندگی جن قواعد و ضوابط پر چل رہی ہے ان کو جاننے کے لئے ہمیں یہ علم حاصل ہے کہ کائنات میں موجود ہر تخلیق دو لہروں پر قائم ہے۔ جب یہ دو لہریں بیک وقت کام کرتی ہیں تو ان سے عالم ناسوت اور انسانی دنیا کی تخلیق ہوتی ہے اور جب مفرد لہر کام کرتی ہے تو اس سے جنات کی دنیا اور ماورائی دنیائیں تخلیق ہوتی ہیں۔

نظریہ رنگ و نور کے مطابق کوئی چیز مجرد ہو، مادی ہو، مرئی ہو، یا غیر مرئی ہو بہرحال دو لہروں سے تخلیق ہورہی ہے۔ کائنات میں موجود کسی شئے کا قیام دو لہروں کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔ ہم جب مرئی اشیاء دیکھتے ہیں تو ہمیں خدوخال نظر آتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ خدوخال سے مرتب اس شئے کو کوئی نادیدہ شئے سنبھالے ہوئے ہے۔ دونوں لہریں اس نادیدہ شئے کے ساتھ ملکر زندگی بن رہی ہیں اور زندگی احساس یا حس کا نام سے جانی جاتی ہے۔

دو لہریں دراصل ایک حرکت ہیں۔ ایسی حرکت جو تواتر کے ساتھ بغیر کسی وقفے کے لمحہ بہ لمحہ ہورہی ہے۔ ہماری تمام

حرکات کا تعلق معین مقداروں سے ہے۔ یہ مقداریں حرکت بن رہی ہیں۔ مکانیت دراصل لمحات ہیں۔ ایسے لمحات جن میں ایسی ترتیب پائی جاتی ہے جس ترتیب کے اوپر مکانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہر لمحہ ایک مکان ہے۔ تمام مکانیت لمحات کی قید میں بند ہے۔ لمحات ایسی بندش کرتے ہیں جن کے اندر مکانیت خود کو قیدی محسوس کرتی ہے۔ یعنی مکانیت لمحات میں قید ہے۔ لمحات کی حرکت کا جہاں تک تعلق ہے یہ سارے کے سارے اللہ کے علم میں حاضر ہیں۔ مکانیت پر اللہ کی پوری گرفت ہے۔ ایسا کوئی لمحہ، جو لمحہ بہ لمحہ زنجیر بن کر کائنات میں مکانیت کی تخلیق کرتا ہے اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔

ایک لمحات کا باطن ہے اور لمحات کا دوسرا رخ ظاہر ہے۔ لمحات کا باطن یا شعور یک رنگ ہے اور دوسری طرف لمحات کا دوسرا رخ ظاہر یا کل رنگ ہے۔ جو چیز نظر آرہی ہے وہ لمحات کا ظاہری رخ "کل رنگ" ہے اور جو رخ نظروں سے اوجھل ہے وہ لمحات کا باطنی شعور "یک رنگ" ہے۔ ایک طرف لمحات کی گرفت میں ساری کائنات ہے دوسری طرف لمحات کی گرفت میں کائنات میں موجود تمام افراد ہیں۔ کائنات کا لمحات کی گرفت میں ہونا یا افراد کا لمحات کی گرفت میں ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ لمحات بیک وقت حرکت کرتے ہیں۔ ایک حرکت کائنات کی ہر شئے

میں الگ الگ واقع ہوتی ہے۔ یہ حرکت اس شعور کی تعمیر کرتی ہے جو شئے کو اس کی مفرد ہستی کے دائرے میں موجود رکھے ہوئے ہے۔ دوسری حرکت کائنات کی تمام حرکتوں میں جاری و ساری ہے۔ یہ حرکت اس شعور کی تعمیر کرتی ہے جو کائنات کی ہر شئے کو ایک دائرے میں حاضر رکھتی ہے۔

لمحات کے ایک رخ میں کائناتی افراد الگ الگ موجود ہیں۔ افراد شکل و صورت کے اعتبار سے یکساں ہونے کے باوجود شعوری دائرے میں الگ الگ ہیں۔ دوسری طرف لمحات میں تمام افراد کا شعور ایک نقطے پر مرکوز ہے۔ ایک انفرادی شعور اور دوسرا اجتماعی شعور ہے۔ ہر فرد بحیثیت فرد کے ایک نوع ہے اور ہر نوع بحیثیت نوع کے ایک فرد ہے۔ جب نوع فرد ہے تو شعور ہے اور جب نوع اجتماعی حیثیت میں نوع ہے تو فرد کا لاشعور ہے۔ ہر فرد دو رخوں میں حرکت کرتا ہے۔ جب وہ اپنی نوع کے اندر حرکت کرتا ہے تو وہ لاشعور ہے۔ جب نوعی اعتبار سے انفرادی حرکت کرتا ہے تو وہ شعور ہے۔ جس طرح ایک فرد کی مثال دی گئی ہے اسی طرح ہم پوری کائنات کو فرد مان لیں اور کائنات کے اندر موجود اشیاء کو اس کے اجزاء فرض کرلیں تو کائناتی شعور کو "مرکزی شعور" کہیں گے۔

مثال :

ہر فرد کے شعور میں اس کے اپنے مخصوص ماحول کے مطابق اشیاء کی موجودگی ہوتی ہے مثلاً ہر فرد اپنے شعور کے مطابق کسی چیز کو پسند یا رد کرتا ہے اور کسی چیز سے مانوس ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنے شعور کے دائرے میں اپنے مخصوص ماحول، مخصوص جذبات و کیفیات کے اعتبار سے چیزوں کو منتخب یا رد کرتا ہے۔ لمحات ایک خاص وقت میں فرد کے شعور کی تعمیر کرتے ہیں۔ ہم کسی چیز کو رد کرتے ہیں یا پسند کرتے ہیں تو یہ رد کرنا یا پسند کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جس چیز کو قبول کیا جاتا ہے وہ کہیں موجود ہے۔ اس موجود سے متعلق ہم اپنے انفرادی شعور کی بنیاد پر رد یا قبول کرلیتے ہیں۔

ہم جب فرد کی حیثیت میں زندگی کے متعلق اطلاعات پر غور کرتے ہیں تو لامحالہ یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ زندگی کے تمام جذبات سے متعلق جو اطلاعات ملتی ہیں ہم ان کو دو طرح سے قبول کرتے ہیں یا دو طرح سے معانی پہناتے ہیں۔ ایک معانی پہنانا انفرادی طور پر معانی پہنانا ہے اور دوسری طرح میں اجتماعی طور پر معانی پہنانا ہے۔

مکانیت اور زمانیت کیا ہے

کائنات جن حواس پر یا کائنات جن بنیادی فارمولوں پر قائم ہے اور چل رہی ہے ان کو بار بار مثالیں دے کر سمجھایا جارہا ہے۔

انسان یا نوع انسانی اور نوع انسانی کی طرح دوسری تمام نوعیں، ان نوعوں میں جنات، فرشتے، اجرام فلکی اور تمام کہکشانی نظام بھی شامل ہیں۔ شعور کے اندر انکی ابتداء ہوتی ہے اور شعور کے ردو بدل ہی سے ابتداء جب انتہا کو پہنچتی ہے تو اس کے مختلف نام رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم ابتداء کو پیدائش کا مرحلہ قرار دیں تو انتہا کو موت کا مرحلہ کہیں گے۔ لیکن جب شعوری حواس میں رہتے ہوئے موت کے مرحلے پر تفکر کرتے ہیں تو موت کا مرحلہ بھی حیات کا ایک قدم ہے۔ ایک ایسی حیات کا قدم جس قدم کے بعد دوسرا قدم حیات ہے۔ انسان اور ساری کائنات جن حواس اور جن شعور میں حیات کے مراحل طے کر رہی ہے۔ وہ چاروں شعور دراصل مختلف کیفیات کے رد و بدل کا نام ہے۔ شعور کی کیفیت یہ ہے کہ ہم اتنے کمزور، ناتواں اور کم عقل ہیں کہ جب کسی چیز کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس چیز کی محدودیت ہمارے اوپر مسلط ہو جاتی ہے۔ یعنی شعور اسقدر محدود

ہوجاتا ہے کہ اگر نظر کے سامنے باریک ترین پردہ بھی آجائے تو بصارت کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ جب ہم محدود کیفیت سے نکل کر لامحدود کیفیت میں داخل ہوتے ہیں تو شعور میں توانائی داخل ہوجاتی ہے۔ اس توانائی سے جو کچھ شعور میں رہتے ہوئے دیکھتے ہیں ادراک کرلیتے ہیں۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ فرد کا شعور، نوع کا شعور، کائنات کا شعور اور ماورائے کائنات کا شعور ہی زندگی کے مراحل کا تعین کرتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم عطا کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات چار شعوروں سے مرکب ہے۔ ان چار شعوروں کو عظیم سائنسدان قلندر بابا اولیاءؒ نے نسمہ مرکب، نسمہ مفرد، نور مرکب اور نور مفرد کا نام دیا ہے۔ یہ چاروں شعور دراصل کائنات کی وہ حقیقت ہیں جس حقیقت پر سارے کائناتی امور متحرک ہیں۔ چار شعوروں کی تقسیم اس لئے ہے کہ ہم کائنات کو الگ الگ اجزاء کے ساتھ تخلیقی فارمولوں کو سمجھ سکیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شعور ایک ہی ہے اور ایک ہی شعور کائنات کی ہر شئے میں الگ الگ دور کررہا ہے۔ جیسے جیسے شعور میں حرکت واقع ہورہی ہے اسی مناسبت سے شعور میں درجہ بندی واقع ہورہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی طرز تعلیم میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے خالق کائنات کے حکم کا تعارف کرایا ہے۔ انبیاء کرام

نے اپنی تعلیم میں زور دیا ہے کہ اس ذات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس کے امر سے کائنات وجود میں آئی۔ اس لئے کہ جب تک ذات مطلق کو نہیں سمجھا جائے گا۔ ذات مطلق کے امر یا حکم کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس بات پر معترض ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ امر کو سمجھنا یا خالق کائنات کی ذات مطلق کے ارادے کو سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے کہ امر جب تک خود کسی انسان کا ادراک نہ بنے امر کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ عظیم سائنسدان قلندر بابا اولیاءؒ کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے اس لئے کہ جب تک امر خود اپنی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا اس ذات مطلق کے تعارف سے محروم رہے گا، جس سے امر وابستہ ہے۔

امر کو سمجھنے کے لئے انسان کو اپنی اس کنہ سے وقوف حاصل کرنا ہوگا جو دراصل انسان کی صورت میں خود امر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان پہلے خالق کائنات کے امر کا تعارف حاصل کرتا ہے۔ جو انسان خود ہے یعنی اس کی حیثیت امر کی ہے۔ جب وہ خود سے متعارف ہوجاتا ہے اور اپنے اندر حکم الٰہیہ سے متعارف ہوجاتا ہے تو وہ ذات مطلق کا تعارف حاصل کرسکتا ہے۔ جب تک کوئی روحانی آدمی امر کو نہیں جانتا نہ خود اپنی ذات سے واقف ہوسکتا ہے اور نہ خالق کائنات کا تعارف حاصل کرسکتا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر روشنی دیکھ کر سوال کیا کون؟

خالق کائنات نے جواباً کہا۔

میں ہوں تیرا رب۔

موسیٰؑ نے جو روشنی دیکھی وہ روشنی امر رب تھی۔ وہ روشنی کس کی تھی؟ وہ روشنی ذات مطلق کی تھی۔ اس واقعے سے ذات مطلق اور ذات امر کی حدود کا تعین ہوجاتا ہے۔ موسیٰؑ ذات امر ہے۔ خالق کائنات ذات مطلق ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے ذات امر ہونے کے باوجود امر کو روشنی میں مشاہدہ کرکے یہ سوال کیا کہ "کون"؟ یعنی امر نے اس بات کی احتیاج محسوس کی کہ وہ ذات مطلق کو پہچانے۔ موسیٰؑ نے روشنی دیکھ کر یہ جان لیا کہ یہ میرا رب ہے۔ موسیٰؑ کو اس بات کی احتیاج ہوئی کہ روشنی امر سے اپنا تعارف کرائے۔ اب یہاں چار باتیں زیر بحث آتی ہیں۔

ایک ذات مطلق۔ ذات مطلق کی صفت ربانیت اور دوسرے موسیٰؑ کے تخلیق ہونے کا وصف۔

ایک طرف ذات مطلق اور اس کی صفات دوسری طرف ذات امر اور اسی کی احتیاج۔

ایک طرف بحیثیت ذات مطلق دوسری طرف موسیٰؑ یا بندہ

بحیثیت بندہ۔

تیسری طرف ذات مطلق اور اسکی صفات۔ وہ تمام صفات جو ربانیت کا احاطہ کرتی ہیں۔

چوتھی طرف موسیٰؑ بحیثیت ذات امر اور ذی احتیاج۔

امر ذات مطلق کا محتاج ہے اور ذات مطلق کسی چیز کی محتاج نہیں ہے یہی وہ چار باتیں ہیں جن پر علوم نبوت کا دارومدار ہے۔ بعض لوگوں نے ذات مطلق کو حقیقت مطلقہ کہا ہے اور امر مطلق کو کائنات کہا ہے۔ یہ طرز بیان حکمائے ربانی کا ہے۔ حکمائے ربانی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اندر تفکر ہے۔ جن کے اندر تلاش ہے۔ جو لوگ اپنی شعور کی سطح سے نکل کر لاشعور میں داخل ہونے کے بعد کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمائے ربانی کے علاوہ انبیاء کرام کی اپنی ایک طرز فکر ہے۔ حکماء اور انبیاء میں فرق یہ ہے کہ انبیاء علم حضوری سے کسی چیز کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور حکمائے ربانی کی طرز تلاش یہ ہے کہ وہ پہلے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ظاہر جس باطن پر قائم ہے اس کو تلاش کرتے ہیں اورتلاش سے کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کائنات میں بے شمار لامحدود چیزیں ایسی ہیں جو ظاہر نہیں ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں ایسی چیزوں کا انکشاف ہوا اور ہورہا ہے جو چیزیں آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ حکمائے

ربانی جن چیزوں کی علامتیں خارج میں نہیں دیکھتے ان کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے کائنات کے اندر مخفی حقائق زیادہ تر انجانے رہ جاتے ہیں۔ حکمائے ربانی کے برعکس انبیاء کا رویہ حقیقت پر مبنی ہے۔ انبیاء کے رویہ میں یہ نقص نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر سے باطن کو تلاش نہیں کرتے بلکہ باطن سے ظاہر کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ ذات مطلق کے ذریعے امر مطلق کو تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی فکر ایسے اجزاء کو پالیتی ہے جو مظاہر کے پابند نہیں ہیں۔ انبیاء مظاہر کو نظر انداز نہیں کرتے تاہم وہ مظاہر کو اصل قرار دے کر صرف مظاہر کی روشنی میں گم نہیں ہوجاتے۔ وہ مظاہر کو بھی اتنی اہمیت دیتے ہیں جتنی مظاہر کی اصلوں کو۔ انبیاء کی طرز فکر یہ ہے کہ وہ مظاہر کو اصل قرار نہیں دیتے۔ باطن کو اصل قرار دیتے ہیں۔ انبیاء کی فکر میں ذات مطلق ہی حیات ہے۔ اس لئے وہ حیات کو ابدی قرار دیتے ہیں۔ وہ کائنات کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ انبیاء کہتے ہیں پہلے حیات ہے پھر کائنات ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہے کہ پہلے کائنات ہو پھر حیات ہو۔ حیات ہے تو کائنات ہے۔ اس کے برخلاف مظاہر کو اولیت دینے والے حکماء اس لئے حیات کی پنہائیوں اور گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے کہ وہ پہلے کائنات کو اہمیت دیتے ہیں پھر حیات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انبیاء نے یہ

بات اپنی طرز فکر سے تحقیق کی ہے کہ فکر انسانی میں ایسی روشنی موجود ہے جو کسی ظاہر کے باطن کا، کسی حضور کے غیب کا مشاہدہ کرسکتی ہے۔ باالفاظ دیگر انسانی ذہن پر یہ بات منکشف ہوجاتی ہے کہ حیات کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے اور انتہا کہاں تک ہے۔ جب ہم ابتدا انتہا کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک بات آتی ہے۔ پھر ابتداء، انتہا تک پہنچنے کے لئے فنا کا راستہ قائم کئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا کرام موت کے بعد کی زندگی کو سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔

آخری نبی محمد الرسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے۔

"مرجاؤ مرنے سے پہلے"

ظاہر زندگی میں اس باطن زندگی کو تلاش کرو جو زندگی کی اصل ہے اور جس زندگی میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ فنا در فنا، فنا در فنا کے مراحل سے گذر کر انسان ایک ایسے نقطے پر پہنچ رہا ہے جس نقطہ کو فنا نہیں ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو ذات مطلق ہے۔

قوانین فطرت

حواس کی دو طرزیں ہیں۔ حواس کی ایک طرز یہ ہے جس کو ہم ظاہری زندگی میں محسوس کرکے کوئی کلیہ قائم کرتے ہیں۔ حواس کی دوسری طرز یہ ہے کہ جہاں حواس کی اصل سے یا حواس کی کنہ سے بحث کی جاتی ہے۔ ظاہر حواس والا کوئی بندہ ظاہر وجود کو اولیت دے کر وجود کے باطن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ باطنی حواس والا بندہ حواس کو وہاں تلاش کرتا ہے جہاں سے حواس بنتے اور تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ حواس تقسیم ہوکر کائنات بنتے ہیں اور کچھ حواس غیر منقسم رہتے ہیں۔ غیر منقسم حواس وہ ہیں جو ابھی تک تقسیم ہوکر مظاہراتی خدوخال میں منتقل نہیں ہوئے۔ منقسم حواس ہی خود کو ازل سے ابد تک کا روپ دے کر کائنات کی شکل و صورت میں پیش کرتے ہیں۔ منقسم حواس میں شکل و صورت کا ہونا ضروری ہے، شکل و صورت کی دو طرزیں ہیں۔ شکل و صورت کی ایک طرز مادی ہے دوسری طرز نورانی ہے۔ مادی شکل و صورت سے روح کا سراغ ملنا ممکن نہیں ہے۔ روح سے مادی شکل و صورت کی کنہ تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ جب تک روح مادیت کو سنبھالے رہتی ہے مادیت قائم رہتی ہے اور جب

روح مادیت سے دستبردار ہوجاتی ہے مادیت فنا ہوجاتی ہے۔

کائنات میں حال اور مستقبل محض مفروضہ ہے، ساری کائنات ماضی ہے۔

آدم ۔ خلاء ۔ روح

موجودہ سائنسدان روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار دوسو بیاسی میل فی سیکنڈ بتاتے ہیں۔ یعنی ایک سیکنڈ کے اندر جو کچھ افعال و اعمال سرزد ہوئے یا ایک سیکنڈ کی مکانیت میں جو حوادث رونما ہوئے انکی رفتار سفر ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل ہے۔ ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل جس مکانیت پر مشتمل ہیں اس کی مکانیت میں جتنے حوادث رونما ہوئے وہ ایک سیکنڈ کے اندر واقع ہوئے اور ایک سیکنڈ کے اندر ہی ایک سیکنڈ کی مکانیت کے تمام افعال سرزد ہوئے۔ اگر کسی طرح ان افعال کا شمار ممکن ہوجائے تو یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک سیکنڈ کتنا طویل ہے اور سیکنڈ کی مکانیت میں کتنی وسعت ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ جب ہم ایک سیکنڈ کی مکانیت ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل تسلیم کرتے ہیں تو ایک سیکنڈ میں رونما ہونے والے کائناتی حوادث یا کائناتی افعال و اعمال تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔

کائنات میں تین زمانے متعارف ہیں۔

1۔ زمان حقیقی

2۔ زمان متواتر

3۔ زمان غیر متواتر

کائنات جو قدم اٹھاتی ہے وہ ایک لمحے کا پابند ہے۔ ساری کائنات لمحات میں بند ہے۔ ایک لمحہ ہویا دوسرا لمحہ ہو۔ دونوں لمحات اس بات کے پابند ہیں کہ وہ لمحے کے اندر موجود رہیں۔ لمحات میں ہی ان کا ظہور ہے۔ کائنات میں کسی وقت ٹھہراؤ نہیں ہے۔ کائنات کا ہر لمحہ متحرک ہے۔ کائنات کا سفر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کا بعد تیسرے نقطے میں تغیر پذیر ہے۔ کائنات میں ہر لمحہ ایک تغیر ہے۔ دوسرا لمحہ دوسرا تغیر ہے۔ ہر لمحہ الگ الگ وجود رکھتا ہے۔ ہر لمحہ کے حوادث جدا ہیں۔ چونکہ ہر لمحہ کے حوادث جدا ہیں اس لئے لمحات زمانے کی جداگانہ وحدتیں ہیں اور ہر وحدت کے درمیان فصل ہے۔

خالق کائنات کا ارشاد ہے۔

"میں نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی۔ اسے علم اشیاء عطا کیا۔ آدم کو خلاء سے بنایا اور اس خلاء میں اپنی روح پھونکی"۔

روح پھونکنے کے بعد آدم کو علم شئے عطا کیا۔ ایک روح الٰہی اور دوسرا علم شئے۔ علم اشیاء حاصل ہونے کے بعد یہ علم ہوا کہ اشیاء کیا ہیں۔ اشیاء کی ماہیت اور حیثیت کیا ہے۔ خود علم اشیاء کیا ہے۔

Equation

روح الٰہی - عالم اشیاء - عالم فطرت (زمان متواتر)

روح الٰہی - روح کے اندر علم اشیاء (تکوین کائنات) = آدم

روح + علم اشیاء = آدم

تشریح ایکویشن

آدم بجتی مٹی (خلاء) ہے۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لئے روح پھونکی گئی۔ جب روح پھونکی تو روح کو علم اشیاء عطا ہوا۔ علم اشیاء عطا ہونے کے بعد آدم کو زندگی گذارنے اور تکوین کائنات سے متعلق جو علوم حاصل ہوئے ان علوم سے قوانین فطرت کو تلاش کرنا عالم فطرت ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ خلاء سے نکل کر روح میں داخل ہو اور اس روح معرفت علم اشیاء حاصل کرے اور علم اشیاء حاصل کرنے کے بعد غیب کا کھوج لگائے۔

Equation

آدم خلاء ہے - خلاء میں روح ہے۔ روح میں علم اشیاء ہے علم اشیاء میں عالم فطرت (زمان متواتر) ہے۔

زمان متواتر - زمان غیر متواتر پر قائم ہے۔ زمان غیر متواتر ہی عالم غیب ہے۔

تین زمانے

اس سے پہلے ہم شعور اور لاشعور کے ضمن میں کافی تفصیلی بحث کرچکے ہیں اور شعور و لاشعور کے ضمن میں یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ انسان نور اور نسمہ سے مرکب ہے۔ یعنی نور اور نسمہ سے انسانی ہستی بنی ہوئی ہے اور یہ نور اور نسمہ ذہن کے غیر شعوری اور شعوری پیمانے ہیں۔

شعوری دنیا میں غیب سے آشنا ہونا ممکن نہیں ہے۔ شعوری دنیا یا زمان متواتر سے نکل کر بندہ لاشعوری دنیا یا زمان غیر متواتر میں داخل ہوجاتا ہے تو اس پر غیب منکشف ہوجاتا ہے اور فرشتوں کی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ دو ایجنسیاں ایسی ہیں جو شعور کے بالمقابل موجود ہیں۔ ایک ایجنسی کا نام غیب الغیب ہے۔ دوسری ایجنسی کا نام غیب ہے۔ غیب الغیب نور مفرد ہے اور غیب نور مرکب ہے۔ غیب الغیب (نور مفرد) اور غیب (نور مرکب) کی تشریح سمجھنا ضروری ہے۔ انسانی ذہن کی تین سطح ہیں اور ہر سطح کے دو دو رخ ہیں۔ ان دو دو رخوں کے الگ الگ نام مرکب روشنی، مفرد روشنی، مطلق روشنی، نور مرکب، نور مفرد اور نور مطلق ہیں۔ مرکب روشنی شعوری دنیا ہے۔ مفرد روشنی لاشعوری

دنیا ہے اور جنات کی دنیا ہے۔ مطلق روشنی فرشتوں کی دنیا ہے۔ نور مرکب سماوات اور ملائکہ سماوی کی دنیا ہے۔ نور مفرد ملاء اعلی کی دنیا ہے۔ جس میں عرش، کرسی، بیت المعمور شامل ہیں۔ نور مطلق بیت المعمور کے اوپر کے حجابات اور زمان حقیقی ہے۔

زمان غیر متواتر سے نکل کر انسان زمان حقیقی میں داخل ہوجاتا ہے۔ انسانی ذہن کی باقی پانچ رخ یعنی شعوری دنیا، شعوری تجربات، شعوری واردات و کیفیات پانچ رخوں پر قائم ہیں۔ پہلا رخ وہم، دوسرا رخ خیال، تیسرا رخ تصور، چوتھا رخ احساس اور پانچواں رخ مشاہدہ ہے۔ ان پانچ رخوں کے بالمقابل عالم فطرت واقع ہے، عالم فطرت سے مراد یہ ہے کہ وہ اطلاعات جو بحیثیت مخلوق کے ہر مخلوق کے لئے ایک اطلاع ہے لیکن ہر مخلوق اس اطلاع کو اپنی حدود میں رہ کر قبول کرتی ہے اور اپنی طرف سے اسمیں کوئی تصرف نہیں کرسکتی۔

تشریح :

کائنات میں تین زمانے ہیں۔

1۔ زمان حقیقی (Timelessness or Real Time)

2۔ زمان غیر متواتر (Non-Serial Time)

3۔ زمان متواتر (Serial Time)

زمان حقیقی :

زمان حقیقی میں کسی قسم کے خدوخال نہیں پائے جاتے محض احساس یا ادراک پایا جاتا ہے۔

زمان غیر متواتر :

وہ زمانہ جس میں نوع صرف نوع ہے اور نوع اپنی نوع جیسی ہستی کے علم سے آگاہ ہے۔

زمان متواتر :

تمام دنیائیں جو زمین (ارض) پر آباد ہیں جو ٹائم کی گرفت میں ہیں وہ دنیائیں جن کا تعلق افراد نوع سے ہے۔

وقت کیا ہے

جب انسانی شعور وہم، خیال اور تصور کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کا رخ مفرد روشنی کی طرف ہوتا ہے اور جب وہم، خیال، تصور سے نکل کر محسوسات کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو شعور مرکب روشنی سے متعارف ہوتا ہے۔ اب ہم اس طرح کہیں گے کہ شعور کے تغیر سے واقف ہونے کا عمل ہی شعور کی ہستی ہے۔

روح نور کے لمحات میں سفر کرتی ہے۔ انسانی ذہن روشنی کے لمحات میں سفر کرتا ہے۔

مثال :

زید ایک فرد ہے سوال کیا جائے کہ زید کون ہے؟ تو یہ کہا جائے گا کہ زید فلاں کا بیٹا ہے۔ فلاں کا بھائی ہے۔ زید عالم ہے۔ زید کی عمر 25 سال ہے۔ زید خوش اخلاق ہے۔ زید عقل مند ہے۔ نوجوان ہے۔ وجیہہ ہے۔ بردبار ہے۔ ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ ہم زید کی صفات کا تذکرہ کررہے ہیں یعنی زید بہت ساری صفات کا مجموعہ ہے اور یہ تمام صفات زید کے اوصاف ہیں۔ ہم گوشت پوست اور ہڈیوں سے بنے ہوئے زید کا تذکرہ

نہیں کرتے بلکہ زید کی صفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اگر ہم زید کی زندگی کا تجزیہ کریں تو یہ کہیں گے کہ زید ان صفات کی فلم ہے۔ زید کی یہ صفات یا زید کی یہ زندگی دراصل اس کی ایک فلم ہے۔ اگر زید سے متعلق اس کے اوصاف کی فلم اور فلم کے اندر آثار و احوال و حوادث کو لپیٹ دیا جائے تو یہ زید کی زندگی کا ایک لمحہ بنا۔

یعنی بیشمار لمحات کا مجموعی نام زید ہے۔ یہ وہی زید ہے جس کو حواس دیکھتے، چھوتے اور جانتے ہیں۔ زید بے شمار لمحات کی لپیٹی ہوئی سربستہ فلم ہے۔

ہم جب کسی شئے کو دیکھتے ہیں تو غیر متواتر لمحہ درمیانی فاصلے کو ہماری لاعلمی میں اس طرح ناپ لیتا ہے کہ نہ تو شئے کی روشنی ذہن سے ہوا بھر الگ رہتی ہے اور نہ ذہن کی سطح میں داخل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شئے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ذہن شئے سے ہوا بھر الگ رہے یا ہوا بھر شئے میں داخل ہوجائے اسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔

آج کے بعد پرسوں کا دن اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک کل کا دن نہ گذر جائے۔ اس طرح جنوری اور ستمبر کے مہینے اس وقت تک نہیں آئیں گے جب تک درمیانی مہینے نہ گذر جائیں۔ ہم جب زینے سے اترتے ہیں تو زینے کی سیڑھیوں کا

ناپ جو پہلے سے ریکارڈ ہے۔ ہمارے قدموں کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ اسی لئے زینے اترنے میں شعوری طور پر سوچنا نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قدم ڈگمگا جاتا ہے یا ہم گر پڑتے ہیں۔ اس وقت کسی وجہ سے ہمارا ذہن ریکارڈ (زمان غیر متواتر) سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ رہنمائی جو زمان غیر متواتر کررہا ہے، زمان متواتر کے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ جس کے سبب قدم غلطی کرجاتے ہیں اور آدمی گر جاتا ہے۔ زینے کا ناپ زمان متواتر میں ریکارڈ نہیں ہوتا۔ غیر متواتر زمان میں ریکارڈ ہے۔

عظیم روحانی سائنسدان

عظیم روحانی سائنسدان قلندر بابا اولیاء نے بتایا کہ فکر انسانی کی تین طرزیں ہیں۔ فکر انسانی کی پہلی طرز یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کی حیثیت سے انفرادی طور پر انسان کے اندر پیدا ہونے والے تقاضوں کو صحیح طور پر استعمال کرتا ہے۔ جب نوع انسانی کا کوئی فرد صحیح طرزوں میں تقاضوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کی ہر طرز نوع انسانی کے لئے اخلاص کا جذبہ ہوتی ہے۔ جب کسی فرد کے اندر نوع انسانی کے لئے خلوص کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تو وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کی فکر انفرادی تقاضوں سے ہٹ کر پورے نوعی تقاضوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے لگتی ہے۔ نوع انسانی کا فرد انفرادی حیثیت سے نکل کر اجتماعی حیثیت میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کے اندر پیدا ہونے والے تقاضے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ سوچ اور پورے تقاضے پوری نوع کو محیط ہوجاتے ہیں۔ انفرادی سوچ نوعی سوچ بن جاتی ہے۔ جب کسی فرد کے اندر نوع انسانی کے مجموعی تقاضوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت بیدار ہوجاتی ہے تو فکر ایسی وسعتوں میں داخل ہوجاتی ہے جہاں نوعی تقاضوں سے

گذر کر کائنات کے مجموعی تقاضے اس پر منکشف ہوجاتے ہیں۔

تین طرزیں :

پہلی فکر : انفرادی سوچ یا انفرادی طرز فکر

دوسری فکر : نوعی سوچ یا نوعی طرز فکر

تیسری فکر : کائناتی سوچ یا کائناتی طرز فکر

نوع انسانی کا ایک فرد جس پر انفرادیت محیط ہے جب نوعی تقاضوں کے لئے اپنے انفرادی تقاضوں کو مغلوب کردیتا ہے تو اس کے اوپر کائنات کے رموز اور کائنات کے مجموعی تقاضے منکشف ہوجاتے ہیں۔ وہ کائناتی تقاضوں سے واقف ہوجاتا ہے۔ جب کو فرد ان تینوں طرزوں سے گذر جاتا ہے تو انسانی فکر ماوراء فکر بن جاتی ہے اور یہ ماوراء فکر، ماوراء کائنات کی حقیقت سے آگاہ کردیتی ہے۔ پہلی طرز فکر سے گذر کر دوسری طرز میں داخل ہونا نوعی طرز فکر بن جاتی ہے اور جب انسان نوعی طرز فکر سے گذر کر کائناتی طرز میں داخل ہوتا ہے تو کائناتی فکر بن جاتی ہے۔

مثال :

ہمارے سامنے گلاب ہے اس لمحے گلاب کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ذہن میں گلاب ہونا اور نہ ہونا ہے۔ جب ہم گلاب کا تذکرہ کرتے ہیں تو سامنے محض گلاب کی ہستی کا اثبات

ہے۔ ہماری فکر کا مرکز گلاب کے علاوہ دوسری شئے نہیں ہوتی۔ گلاب کی ہستی کا تذکرہ کرتے وقت گلاب کو اثبات میں بیان کرتے ہیں۔ اس خاص لمحے کو ساری کائنات کو ایک یونٹ شمار کرتے ہیں۔ یہ یونٹ وہ ہے جس کا نام گلاب ہے۔ جب تک اس یونٹ کا تذکرہ نہ کردیں جو لمحہ گلاب کا لمحہ ہے اس وقت تک دوسرے یونٹ سے رابطہ قائم نہیں کرسکتے۔ فکر انسانی میں جو کچھ ہے وہ لمحہ وار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لمحہ کتنا ہے اور لمحے کا وقفہ کتنا ہے۔ لمحہ کا وقفہ کروڑواں یا اس سے بھی کم ہوسکتا ہے۔ لیکن ذہن ایک وقت میں، ایک لمحہ میں کسی ایک چیز کا ادراک کرسکتا ہے۔ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایک لمحہ میں بہت ساری چیزیں دیکھ رہے ہیں اور محسوس کررہے ہیں۔ لمحے کو الگ الگ تصور نہیں کرسکتے۔ لمحہ اتنا کم ہے اور لمحہ کی کسر اتنی کم ترین ہے کہ ہم اسے لمحہ بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ کروڑواں حصہ قرار دیتے ہیں۔ نظریہ رنگ و نور یہ ہے کہ ایک وقت میں کسی شئے کے لئے ایک لمحہ ذہن کے لئے مرکز بنتا ہے۔ لیکن بہت زیادہ ہونے سے کم ترین کسر کو الگ نہیں کرسکتے۔ اس خاص فرد کے علاوہ کائنات کے افراد جب تک ساکت نہ ہوجائیں ہم ایک فرد کا احساس نہیں کرسکتے۔ بظاہر ہم آگے پیچھے اوپر نیچے دیکھتے ہیں۔ آگے پیچھے دیکھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب

تک ہمارا ذہن اس سمت میں مرکوز نہ ہوجائے۔

ہم چھ سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ یا چھ سمتوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے۔ روحانی نقطہ نظر سے چھ سمتیں محض قیاس کی پیداوار ہیں۔ فی الحقیقت سمت وہی ہے جس سمت میں ہمارے ذہنی تقاضے سفر کررہے ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ زمانہ گذرتا رہتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ زمانہ ریکارڈ ہوتا ہے۔ آج جو فرد تیس سال کا ہے وہ بچپن سے تیس سال تک سفر کرتا رہا ہے۔ زندگی کے ریکارڈ ہونے کو ہی قرآن پاک میں کتاب المرقوم کہا گیا ہے۔ یہی کتاب المرقوم یا ریکارڈ زمانہ، علم الاسماء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم الاسماء سکھایا۔ جو کچھ اللہ نے سکھایا وہ ریکارڈ ہوگیا۔ وہی ریکارڈ آدم سے لے کر آدم کی نسل کو منتقل ہورہا ہے۔

کائنات ایک نقطہ ہے جسے اپنے ذہن میں فرض کرنا پڑتا ہے۔ یہی کائنات کی موجودگی کا راز ہے۔ ریاضی دانوں کی اصطلاح میں نقطہ نہ لمبائی رکھتا ہے، نہ چوڑائی رکھتا ہے اور نہ گہرائی رکھتا ہے۔ وہ صرف شعور کی تخلیق ہے۔ یہی نقطہ شعور سے مسافرت کرکے ادراک بالحواس بنتا ہے۔ اس کے ادراک بالحواس بننے کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ پہلے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ شعور فی نفسہ کیا چیز ہے۔ وہ خود کو قائم رکھتا ہے اور اپنی یاد دہانی میں

مصروف رہتا ہے۔ شعور جس ریکارڈ پر قائم ہے اس ریکارڈ کو دہراتا رہتا ہے۔ آج جو بچہ پیدا ہوتا ہے جب بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے تو دراصل یہ شعور کے ریکارڈ کا دہرانا ہے۔ اگر شعور اپنے ریکارڈ کو نہ دہرائے اور شعوری یاد دہانی میں مصروف نہ رہے تو بچہ جوانی میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جوانی دراصل بچپن سے جوانی تک شعوری ریکارڈ کی یاد دہانی ہے۔

بچپن میں جب ہوش و حواس کا دور شروع ہوتا ہے تو بچہ چاند سورج سے واقف ہوتا ہے۔ بچہ کو شعوری طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ قلم ہے، یہ کتاب ہے۔ یہ شعوری ریکارڈ ہوگیا۔ یہی ریکارڈ وہ بڑھاپے سے موت تک استعمال کرتا رہتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بچہ کسی کتاب کو درخت کہے یا درخت کو کتاب کا نام دے۔ جو کچھ شعور میں ریکارڈ ہوگیا وہی شعور ہے۔ شعور اپنے ریکارڈ کو یاد ریکارڈ میں موجود نقوش کو یا ریکارڈ میں موجود تصویروں کو مختلف طریقوں میں استعمال کرتا ہے۔ طریقے بہت سے ہیں۔ ان میں ایک طریقہ جو تمام نوعوں میں مشترک ہے نگاہ ہے۔ شعور اپنے ریکارڈ کو نگاہ کے ذریعے دیکھتا، استعمال کرتا اور دہراتا ہے۔ نگاہ ہمارے اندر کام کرتی ہے۔ وہ دو مرکزوں کو دیکھتی ہے۔ نگاہ کی ایک مرکزیت میں دیکھنا شعور اور دوسری مرکزیت میں دیکھنا غیب ہے۔ نگاہ کا دیکھنا شعور میں ہو یا غیب

میں ہو، نگاہ کا دیکھنا انفرادی ہو، نگاہ کا دیکھنا اجتماعی ہو، درحقیقت دونوں مرکزوں میں ایک نگاہ کام کررہی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے بادام کا ایک درخت ہوتو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بادام کا درخت ہے۔ پھر ہم نوع انسانی کے دوسرے فرد سے پوچھتے ہیں تو وہ بھی یہی کہتا ہے کہ یہ بادام کا درخت ہے۔ ایک آدمی کے علاوہ ہم ہزاروں افراد سے یہی سوال کرتے ہیں تو ہر آدمی یہی کہتا ہے کہ یہ بادام کا درخت ہے۔ یہ بات اس کی شاہد ہے کہ دیکھنے والی نگاہ ایک ہے۔ اگر نگاہیں دو ہوتیں تو ہر نگاہ کا زاویہ مختلف ہوتا۔ جب ہم دو کہتے ہیں تو دراصل ایک سے دو ہونا مختلف ہے۔ ایک نگاہ کچھ دیکھتی اور دوسری نگاہ کچھ اور دیکھتی۔ اس لئے لازماً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شعور کی ایک سطح اجتماعی ہے جس میں کائنات مشترک ہے۔

کائنات ایک نقطہ ہے

کائنات ایک نقطہ ہے۔ جب یہ نقطہ خود کو دہراتا ہے تو دہرانے کے عمل سے اس نقطے کے دو نقطے ہوجاتے ہیں۔ پھر یہ نقطہ خود کو دہراتا ہے تو اس نقطے کے مزید دو نقطے بن جاتے ہیں۔ ازل سے اسی طرح ہورہا ہے۔ شعور کی تکرار سے بے شمار نقطے بن رہے ہیں اور بے شمار نقطے ایک دائرے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ تمام دائرے مل کر بڑا دائرہ بناتے ہیں۔ یہی بڑا دائرہ کائنات ہے۔

جب ہم دائرے کا تذکرہ کرتے ہیں تو دائرے کے ساتھ ساتھ لامحالہ مثلث کا بھی تذکرہ آتا ہے۔ نقطہ جب خود کو دہراتا ہے تو دائرہ بنتا ہے اور ایک دائرے سے دوسرا پھر تیسرا دائرہ بن کر بڑا دائرہ بنتا ہے۔ یہ بڑا دائرہ (ساری کائنات) دراصل افراد کے اوپر قائم ہے۔ یہ افراد ایک طرف دائرہ ہیں تو دوسری طرف مثلث ہیں۔

انسان کے ادراک میں جو کچھ ہے وہ حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق رات کے حواس سے ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق دن کے حواس سے ہے۔ ایک کا نام

لیل ہے اور دوسرے کا نام نہار ہے۔ ایک دائرے کا نام خواب اور دوسرے کا نام بیداری ہے۔ نوع انسانی میں رات کے حواس کو تاریکی، غنودگی یا نیند کہہ کر غیر حقیقی تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ کائنات میں کوئی غیر حقیقی تصور نہیں ہے۔ اگر ہم غور و فکر کریں تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ دن کے حواس کو اجتماعی شہادت حاصل ہے اور رات کے حواس کو انفرادی۔ لیکن کسی بھی طرح یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اجتماعی شہادت میں بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں۔

جب ایک فرد دوسرے سے متعارف ہوتا ہے چونکہ زمان میں دونوں افراد موجود ہیں اور رشتہ مشترک ہے اس لئے ذات ایک نقطے پر ٹھہر جاتی ہے۔ یہ ٹھہراؤ دراصل دیکھنا ہے۔

انسانی شعور جب اللہ کی دی ہوئی سماعت یا دی ہوئی بصارت کو استعمال کرتا ہے تو اس بصارت یا سماعت کو خود سے منسوب کرنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے دیکھا، میں نے سنا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اللہ کی سماعت سے سنا اور اللہ کی بصارت سے دیکھا۔ جب کوئی انسان اللہ کی سماعت و بصارت کو خود سے منسوب کرتا ہے تو یہاں سے غلطیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کے معانی میں غلطیاں کرنے لگتا ہے۔

"وہی ہے جس نے تم کو بنایا ایک نفس سے"۔ (القرآن)

تمام نوع انسانی مخفی اسکیم کے تحت بنائی گئی ہے۔ وہ مخفی اسکیم پابند حواس میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے مخفی اسکیم مظاہر کے پیچھے کام کررہی ہے۔

قران پاک میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"ہم نے مریم پر وحی کی"۔

مریم پر وحی کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عوام پر بھی القا یا وحی کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت مریم رسول یا نبی نہیں تھیں۔ وحی یا القا کا تعلق خالق کائنات کی دی ہوئی سماعت اور بصارت سے ہے۔ خالق کائنات کی دی ہوئی سماعت اور بصارت ہی عوام کی نگاہ و سماعت ہے۔ ہر انسان کو یہ صفت حاصل ہے اور انسان اس صفت کو ضمیر کے نام سے پہچانتا ہے۔ وہ ضمیر کی آواز سنتا ہے۔ اس آواز کی رہنمائی میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ ضمیر کی آواز فی الواقع خالق کی آواز ہوتی ہے اور خالق کا بخشا ہوا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ضمیر رہنمائی کرتا ہے تو نفس کی تنقید شروع ہوجاتی ہے۔ یہ تنقید انسان کی نیت کو غلط یا صحیح رکھتی ہے۔

مذہب

جب ہم کائنات اور کائنات میں موجود نوعوں کا اور نوعوں کے افراد کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں اس تذکرے کو مکمل کرنے کے لئے تین مقامات سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ تین مقامات ہی دراصل کائنات کی تخلیق کا وہ عمل ہیں جس عمل پر کائنات موجود ہے اور کائنات میں زندگی کے آثار و احوال پائے جاتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ انسان جب انفرادی طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہے یا زندگی کو انفرادی دائرے میں رہ کر سمجھنا چاہتا ہے تو اس کی سوچ محدود ہوتی ہے۔ اس کے اندر اخلاص نہیں ہوتا۔ کسی فرد کے اندر اخلاص کے معانی یہ ہیں کہ وہ انفرادی سوچ سے بالاتر ہوکر نوعی سوچ کو اپنالے۔ جب کوئی بندہ انفرادی طور پر آزاد ہوکر نوعی سوچ کو اپنا لیتا ہے تو اس کے اندر اخلاص کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ اس کی فہم و فراست انفرادیت سے نکل کر اجتماعی بن جاتی ہے۔ پھر یہی فرد جب اپنی نوع سے نکل کر کائنات کے اندر تمام نوعوں کے بارے میں تفکر کرتا ہے تو اخلاص کا یہ چشمہ بہت برا چشمہ بن جاتا ہے اور پوری نوعوں پر محیط ہوجاتا ہے۔ اس صورت میں انسان

کی فہم و فراست نوعی درجہ بندیوں سے گزر کر کائناتی بن جاتی ہے۔ جب کسی انسان کے اندر اس کی سوچ کائنات کو احاطہ کرلیتی ہے تو کائنات سے اسکا رشتہ مستحکم ہوجاتا ہے اور وہ کائنات میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیتا ہے۔

ہم انسانی جسم کو مادی جسم کہتے ہیں۔ اس مادی جسم سے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ لاشعور نے بنایا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو غذا انسان کو خارج سے ملتی ہے اس سے خون اور جسم بنتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہی جسم ایک خاص وقت میں ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے اور یہی جسم باوجودیکہ انتہائی ضعیف اور کمزور ہوجاتا ہے لیکن جسم ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ خارج سے ملنے والی غذا سے خون اور جسم تخلیق ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ روشنی مادہ کی شکل میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ عظیم روحانی سائنسدان اس بات کو مثال دے کر بیان فرماتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں ایک سے زیادہ مرتبہ سخت ترین بیماریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بیماری کے زمانے میں غذا کم سے کم رہ جاتی ہے یا مفقود ہوجاتی ہے۔ غذا کم ہونے یا مفقود ہوجانے سے موت واقع نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جسمانی مشین زندگی کو چلانے کی ذمہ دار نہیں ہے۔ ان مشاہدات سے یہ بات تحقیق ہوجاتی ہے کہ خارج سے انسانی جسم کو جو کچھ ملتا ہے وہ

زندگی کا موجب نہیں ہے۔ زندگی کا موجب صرف لاشعور کی کارفرمائی ہے اور کل ذات سے روشنی کی منتقلی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ چند ماہ کا ہوجاتا ہے۔ پھر ساٹھ ستر اسی اور نوے سال کا ہوجاتا ہے۔ اس کے خیالات میں اسکے علم و عمل میں ہر لمحہ تغیر ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اس کے جسم کا ہر ذرہ بدل جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص نہیں بدلتا۔ وہ جو کچھ چند ماہ کی عمر میں تھا وہی نوے سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اگر اس کا نام زید ہے وہ ہمیشہ زید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کل ذات سے جو تصور انسانی شعور کو منتقل کردیا جائے وہ ہی تصور قائم رہتا ہے۔ چاہے جسم کا ایک ایک ذرہ تبدیل ہوجائے۔

زید کیا ہے؟ فی الواقع ہم جب زید کی بنیاد Base Line کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ زید کل ذات ہے۔ ردو بدل کل ذات میں نہیں یک ذات میں ہورہا ہے۔

سورہ حدید میں بیان ہوا ہے۔

"وہی ہے جو ہر شئے کو محیط ہے"۔

کائنات کا علم یک ذات کو حاصل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب زید کل ذات ہے تو اسے کائنات کا علم کیوں حاصل

نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ زید اپنی ذات کے اندر گم رہتا ہے اور کل ذات سے لاتعلق رہتا ہے۔ زید اپنی ذات سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ قانون یہ ہے کہ اگر کوئی فرد اپنی حدود میں رہ کر اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے تو اسکی سوچ محدود ہے محض ذات کی حدود میں سوچنے سے اس کے اندر محدودیت پیدا ہونے کی بنا پر اخلاص پیدا نہیں ہوتا۔ محدود انفرادی سوچ محدود حواس ہیں اور نوعی سوچ لامحدود حواس ہیں۔ جب فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے تو لامحدود حواس کل ذات کی روشنی بن جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کی تمام دل چسپیاں اپنے خاندان تک محدود ہیں اس کی سوچ خاندان کی حدود میں سوچتی ہے۔ جتنی فہم محدود ہوگی، مشاہدات اسی مناسبت سے محدود ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی ایک شخص نے اپنی تمام دلچسپیاں محض خاندان تک محدود رکھ کر اپنی فہم کو محدود کرلیا ہے۔ فہم خاندان تک محدود ہونے کی بناء پر وہ خاندان سے باہر دیکھنے سے قاصر ہے۔ یہ قانون ہے کہ انسان کی آنکھ، کان اپنی فہم کی حدود میں دیکھتے اور سنتے ہیں۔ وہ فہم کی حدود سے باہر نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں۔

وہ انسان جس کی سوچ صرف اپنی ذات تک محدود ہے کبھی ماورائی دنیاوں کے راستوں پر قدم نہیں بڑھا سکتا۔ ماورائی دنیاوں

کے راستے پر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ انفرادی سوچ سے آزاد ہوجائے اور اس کے اندر انفرادی سوچ کی جگہ اجتماعی سوچ متحرک ہوجائے۔ انسانی زندگی میں مذہب اس لئے ضروری ہے کہ ہر مذہب فرد کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ انفرادی سوچ سے نکل کر اجتماعی سوچ کو اپنی طرز زندگی بنا لیا جائے۔ ہر مذہب بھائی چارے کا حکم دیتا ہے۔ ہر مذہب محبت کرنا سکھاتا ہے۔ ہر مذہب کی تعلیمات یہ ہیں کہ تفرقہ نہ ڈالو۔ متحد ہوکر رہو۔ ہر مذہب تعلیم دیتا ہے کہ جو کچھ اپنے لئے چاہو دوسروں کے لئے بھی چاہو۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب انسان کے لئے لازمہ حیات ہے۔ جب تک کوئی آدمی مذہبی اقدار کو نہیں اپنائے گا۔ اس کے اندر کائنات سے متعلق اخلاص پیدا نہیں ہوگا اور جب تک کسی قوم کے اندر ایمان اور یقین نہیں ہوگا، کائنات کا اخلاص نہیں ہوگا، انفرادی سوچ رکھنے والی قوم کائناتی قدروں کا مشاہدہ نہیں کرسکتی۔ اس وضع کی قومیں ہزاروں سال کی عمر پانے کے باوجود پالنے کا بچہ رہتی ہیں۔

یہ روشنی جس کو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں یک ذات اور کل ذات کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اس روشنی کے ذریعے کل ذات کے تصورات یک ذات کو منتقل ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہیں گے کہ کل ذات جو اطلاعات یک ذات کو دیتی ہے

ان اطلاعات کو یہ روشنی، رنگ اور روشنی، ابعاد (Dimension) دیکر یک ذات کو پہنچاتی ہے۔ اس کی مثال ٹیلویژن سے دی جاسکتی ہے۔ ٹی وی کی سطح پر وہ ساری چیزیں نظر آتی ہیں اور آوازیں آتی ہیں جو اسٹیشن سے ارسال کی جاتی ہیں۔ جس وقت یہ ترسیل منقطع ہوجاتی ہے تو نہ تصویر دکھائی دیتی ہے اور نہ آواز سنائی دیتی ہے۔

یہی حال کل ذات سے آنے والی اطلاعات کا ہے۔ نوع انسانی کے افراد کو روشنی کے ذریعے اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ جس طرح اطلاع ملتی ہے انسانی افراد اسی طرح دیکھتے اور جانتے ہیں۔ جس روشنی میں ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ یک ذات اور کل ذات کے درمیان پردہ ہے۔

قرار مکین

قرآن پاک میں ہے۔

"ہم نے ہر چیز کو معین مقداروں میں پیدا کیا ہے"

تفکر کیا جائے تو ساری کائنات میں یہی قانون جاری و ساری ہے۔ ہر چیز، ہر نوع اپنی مخصوص معین مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور اسے برقرار بھی رکھتی ہے اور نسل در نسل انہی معین مقداروں کو منتقل کرتی رہتی ہے۔ مثلاً بلی کی نسل کتا نہیں ہوتی، بکری کے بطن سے شیر پیدا نہیں ہوتا اور نوع انسانی سے انسان کے علاوہ دوسری کوئی نوع تخلیق نہیں ہوتی۔

قانون یہ بنا کہ ہر نوع اپنی معین مقداروں کی وجہ سے اپنا الگ تشخص رکھتی ہے اور انہی معین مقداروں کی نسل در نسل منتقلی سے ہر نوع کا الگ الگ تشخص قائم رہتا ہے۔

معین مقداریں کیا ہیں؟

معین مقداریں دراصل روشنیاں ہیں جو ایک خاص تناسب سے ردوبدل ہوکر کسی نوع کی تخلیق کرتی ہیں۔ ان تخلیق کرنے والی روشنیوں کو عظیم روحانی سائنسدان قلندر بابا اولیاءؒ نے نسمہ مرکب کا نام دیا ہے۔

قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"اللہ روشنی ہے آسمانوں اور زمین کی"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے :

God said Light and there was Light

"اللہ نے کہا روشنی! اور روشنی موجود ہوگئی"

کیرلین فوٹو گرافی کے ذریعے نسمہ کے روشن عکس کی تصویر کو سائنسدان کیرلن نے Aura کا نام دیا ہے۔

پیراسائیکلوجی کی لامحدود نظر ہمیں بتاتی ہے کہ یہ معین مقداریں کس طرح ڈسپلے کرتی ہیں۔ روشنیوں کی یہ معین مقداریں کہیں الیکٹران، پروٹون اور نیوٹرون کی صورت میں اپنا مظاہرہ کررہی ہیں تو کہیں کروموسومز کی معین تعداد میں فعال اور متحرک ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں :

کسی بھی عنصر کو اگر دیکھا جائے تو ہر عنصر کا ایٹامک نمبر اور ایٹامک ویٹ ہوتا ہے۔

یہ ایٹامک نمبر کیا ہے ؟

یہ کسی عنصر میں موجود الیکٹران یا پروٹون کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے یعنی ہر عنصر ایک مخصوص تعداد میں موجود الیکٹران یا پروٹون کا مظاہرہ ہے۔ اگر کسی طریقے سے اس عنصر میں موجود پروٹونز کی تعداد کو تبدیل کردیا جائے تو یہ عنصر اسکی تبدیلی کے

مطابق دوسرے عنصر کی ہیئت اختیار کریگا۔

نظریہ رنگ و نور کا شعور ہمیں بتاتا ہے کہ جانداروں میں روشنیوں کی یہ معین مقداریں کروموسومز کی شکل میں اپنا مظاہرہ کرتی ہیں۔

ماہرین جینیات اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ ہر نوع کے لئے کروموسومز کی علیحدہ اور مخصوص تعداد ہے۔ بلی کے لئے علیحدہ، بکری کے لئے علیحدہ، شیر کے لئے علیحدہ اور انسانوں کے لئے علیحدہ کروموسومز کی تعداد مقرر ہے۔

نوع انسانی میں کروموسومز کے ۲۳ جوڑے (کل ۴۶ کروموسومز) ہوتے ہیں۔ روشنیوں کا مخصوص تناسب یا معین مقداریں دراصل کسی نوع کا تخلیقی فارمولا ہے۔ یہی نوعی فارمولا نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے کسی مخصوص نوع کا اپنا الگ تشخص برقرار رہتا ہے۔

نوعی فارمولے کی معین تعداد نسل در نسل کیسے برقرار رہتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں تخلیقی عمل کا جائزہ لینا ہوگا۔

انسانی جسم میں ہر وقت خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ اور تقسیم جاری رہتی ہے۔ اس تقسیم سے نئے نئے خلیئے تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ نئے بننے والے تمام خلیوں میں کروموسومز کی تعداد وہی رہتی ہے جوکہ پرانے خلیوں میں تھی۔ یعنی پرانے خلیوں میں

۴۶ کروموسومز ہیں تو نئے بننے والے خلیات میں بھی ۴۶ کروموسومز ہوں گے۔ لیکن تولیدی نظام میں جہاں تخلیقی خلیئے یعنی Sperm (مرد میں) اور Ova (عورت میں) بنتے ہیں، خلوی تخفیف اس طرح ہوتی ہے کہ خلیوں میں کروموسومز کی تعداد آدھی رہ جاتی ہے۔

قرآن پاک میں تخلیقی عمل کو بڑے آسان پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور ہم نے بنایا آدمی کو بجنی مٹی سے۔ پھر ہم نے رکھا اس نطفہ کو قرار مکین (رحم مادر) میں پھر بنایا نطفہ سے علقہ پھر بنایا اس علقہ سے مضغہ پھر بنایا مضغہ سے عظما اور پھر چڑھایا عظما پر لحما پھر اٹھا کر کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں۔ سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے"

Sperm یعنی نطفہ اور Ova آپس میں ملے اور ملاپ کے نتیجے میں جو چیز بنی اس کو قرآن حکیم علقہ (Zygote) کا نام دیتا ہے۔ علقہ تقسیم در تقسیم ہوکر مضغہ (Blastocyst) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

علقہ بننے کے سات یا آٹھ دن بعد قرار مکین یعنی رحم مادر میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ مضغہ جہاں پر اپنی جگہ بنا لیتا ہے

وہاں پر اس کی اور ماں کی شریانوں اور وریدوں کی چھوٹی چھوٹی جالیاں بن جاتی ہیں جوکہ آپس میں بہت قریب ہوتی ہیں۔ اسی رابطہ کے ذریعے بچے کو خوراک ملتی ہے۔ اب مضغہ سے عظما بنا اور اسی عظما پر گوشت چڑھا یعنی ابتدائی شکل میں بچہ (Embryo) وجود میں آگیا۔ پھر اس سے مکمل بچہ بن گیا۔ یہ سارا تخلیقی عمل رحم مادر میں ہوتا ہے۔

شکم مادر میں اگر روشنیوں میں توازن ہے تو بچہ پوری مردانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اگر روشنی کی مقدار بہت زیادہ یا بہت کم ہوجائے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ بعض مردوں میں مردانہ وجاہت کم اور نسوانیت زیادہ ہوتی ہے۔ بات کرنے کا انداز، چال ڈھال اور شکل و صورت میں صنف نازک کا عکس جھلکتا ہے اس کی وجہ بھی روشنیوں میں یکسانیت کا نہ ہونا ہے۔

تخلیقی لحاظ سے عورتوں میں نیلا رنگ غالب ہوتا ہے اور مردوں میں گلابی رنگ غالب ہوتا ہے۔

کروموسومز کی ساخت پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہ جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر جوڑے کا ایک بازو ماں کی طرف سے اور دوسرا باپ کی طرف سے ہوتا ہے۔ کروموسومز پروٹین اور DNA سے ملکر بنا ہے۔ DNA کی اکائی کو Gene کہا جاتا ہے۔ جین ہی کے ذریعے ماں

باپ کا شعور اور عادات و اطوار بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ ماحول سے بچہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ بھی اسی جین میں اسٹور ہوتا ہے۔ وراثتی بیماریاں، خیالات و تصورات، صلاحیتیں، شکل و شباہت، بلڈ گروپ، رنگ و روپ، خاندانی اقدار سب کچھ جین میں ریکارڈ کی صورت میں موجود ہے۔ مادی طور پر دیکھا جائے تو جین دراصل نوعی ریکارڈ ہے۔

بچہ کا آدھا شعور والدین سے بنتا ہے اور آدھا شعور ماحول سے بنتا ہے۔ نسمہ پہلے خیال قبول کرتا ہے پھر یہ خیال جین تک پہنچتا ہے اور یہی جین خلیہ کو ہدایات دیتا ہے اور خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ ساری زندگی انہی ہدایات پر عمل درآمد ہوتا رہتا ہے۔

دوران حمل کس طرح ماں کے تصورات بچے پر اثرانداز ہوتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً دوران حمل اگر ماں پریشان ہے، بے سکون ہے تو بچہ دماغی طور پر کمزور ہوتا ہے۔

مثال :

ایک انگریز ماں کے بطن سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جس کے نقش و نگار اور رنگ حبشی نژاد بچوں کی طرح تھے۔ موٹا ناک نقشہ، گھونگھریالے بال، سیاہ رنگ، چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط

اعصاب، بچہ کی پیدائش کے بعد باپ نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ بچہ اسکا ہے۔ جب معاملہ بہت زیادہ الجھ گیا اور تحقیق و تفتیش اپنی انتہا کو پہنچی تو یہ راز کھلا کہ ماں حمل کے زمانے میں جس کمرے میں رہتی تھی، وہاں دیوار پر ایک حبشی بچے کا فوٹو آویزاں تھا۔ بڑے بڑے نفسیات داں، دانش وروں اور ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور باہمی صلاح و مشورے اور افہام و تفہیم سے یہ بات طے پائی کہ اس کمرے میں ایک حبشی بچے کا فوٹو لگا ہوا تھا اور عورت حمل کے زمانے میں بچے سے فطری اور طبعی طور پر قریب رہی اور بار بار حبشی بچے کو دیکھتی رہی تھی۔ دیکھنے میں اتنی گہرائی پیدا ہوگئی کہ اس کی فیلنگ پیٹ میں موجود بچے میں منتقل ہوگئی۔

دوسرا تجربہ یہ کیا گیا کہ دوسری بار جب وہ امید سے ہوئی تو وہاں ایک خوبصورت انگریز بچے کا فوٹو آویزاں کیا گیا اور تجرباتی طور پر ماں کو ہدایت کی گئی کہ اس فوٹو کو زیادہ سے زیادہ دیکھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش تقریباً وہی تھے جو دیوار میں لگے ہوئے فوٹو کے تھے۔

انسان فرشتہ اور جنّات

نظریہ رنگ و نور کے پیروکار حضرات اولیاء کرام کس طرح سوچتے ہیں اور انکی فہم و فراست میں نور کس حد تک کام کرتا ہے اس کے بارے میں حضرت قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

میرے نانا تاج الدین ناگپوریؒ خصوصی مسائل ہی میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اپنی گفتگو کے اندر ایسے مرکزی نقطے بیان کرجاتے تھے جو براہِ راست قانون قدرت کی گہرائیوں سے ہم رشتہ ہیں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہورہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین من وعن ہر وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے اور محسوس کرتے تھے جو ناناؒ کے ذہن میں ہوتی تھی۔ یہ بات بالکل عام تھی کہ چند آدمیوں کے ذہن میں کوئی بات آئی اور یکایک ناناؒ نے اس کا جواب دے دیا۔

مرہٹہ راجہ رگھوراؤ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتا تھا۔ مہاراجہ مخفی علوم سے مس بھی رکھتا تھا اور اس کے اندر فیضان حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ایک مرتبہ مہاراجہ نے سوال کیا۔ ”بابا صاحب ! ایسی مخلوق جو نظر نہیں آتی مثلاً

فرشتہ یا جنّات، خبر متواتر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جتنی آسمانی کتابیں ہیں ان میں اس قسم کی مخلوق کے تذکرے ملتے ہیں۔ ہر مذہب میں بدروحوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے لیکن عقلی اور علمی توجیہات نہ ہونے سے ذی فہم انسانوں کو سوچنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رکتے ہیں کہ "ہم سمجھ گئے" تجربات جو کچھ زبان زد ہیں، وہ انفرادی ہیں، اجتماعی نہیں۔ آپ اس مسئلہ پر کچھ ارشاد فرمائیں"۔

جس وقت یہ سوال کیا گیا، نانا تاج الدینؒ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ اوپر تھی۔ فرمانے لگے۔ "میاں رگھو راؤ ! ہم سب جب سے پیدا ہوئے ہیں، ستاروں کی مجلس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی رات ایسی ہو کہ ہمارے نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھتی ہوں۔ بڑے مزے کی بات ہے، کہنے میں یہی آتا ہے کہ ستارے ہمارے سامنے ہیں، ستاروں کو ہم دیکھ رہے ہیں، ہم آسمانی دنیا سے روشناس ہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور ماہ و انجم کی کون سی دنیا سے روشناس ہیں۔ اس کی تشریح ہمارے بس کی بات نہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں، قیاس آرائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی سمجھتے یہی ہیں کہ ہم جانتے ہیں۔ زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ جانتا ہے تو یہ قطعاً نہیں سوچتے کہ اس دعوے کے اندر حقیقت

ہے یا نہیں"۔

فرمایا "جو کچھ میں نے کہا اسے سمجھو، پھر بتاؤ کہ انسان کا علم کس حد تک مفلوج ہے۔ انسان کچھ نہ جاننے کے باوجود اس کا یقین رکھتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ چیزیں دُور پرے کی ہیں۔ جو چیزیں ہر وقت انسان کے تجربے میں ہیں، ان پر بھی نظر ڈالتے جاؤ۔ دن طلوع ہوتا ہے۔ دن کا طلوع ہونا کیا شے ہے۔ ہمیں نہیں معلوم طلوع ہونے کا مطلب کیا ہے ہم نہیں جانتے۔ دن رات کیا ہیں؟ اس کے جواب میں اتنی بات کہہ دی جاتی ہے کہ یہ دن ہے۔ اس کے بعد رات آتی ہے۔ نوع انسانی کا یہی تجربہ ہے۔

میاں رگھوراؤ، ذرا سوچو کیا سنجیدہ طبعیت انسان اس جواب پر مطمئن ہوجائے گا؟ دن رات، فرشتے نہیں ہیں۔ جنّات نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ مظاہر ہیں جن سے ایک فرد واحد بھی انکار نہیں کرسکتا۔ تم اتنا کہہ سکتے ہو کہ دن رات کو نگاہ دیکھتی ہے، اس لئے قابل یقین ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ نگاہ کے ساتھ فکر بھی کام کرتی ہے۔ اگر نگاہ کے ساتھ فکر کام نہ کرے تو زبان نگاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکتی۔ دراصل نگاہ اور فکر سارے کا سارا عمل تفکر ہے۔ نگاہ محض ایک گونگا ہیولیٰ ہے۔ فکر ہی کے ذریعے تجربات عمل میں آتے ہیں تم نگاہ کو تمام حواس پر

قیاس کرلو۔ سب سے سب گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ تفکر ہی حواس کو سماعت اور بصارت دیتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ حواس تفکر سے الگ کوئی چیز ہے حالانکہ تفکر سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان محض تفکر ہے۔ فرشتہ محض تفکر ہے۔ جن محض تفکر ہے۔ علی ہذا القیاس ہر ذی ہوش تفکر ہے۔

فرمایا کہ اس گفتگو میں ایک ایسا مقام آجاتا ہے جہاں کائنات کے کئی راز منکشف ہوجاتے ہیں۔ غور سے سنو! ہمارے تفکر میں بہت سی چیزیں ابھرتی رہتی ہیں۔ دراصل وہ باہر سے آتی ہیں۔ انسان کے علاوہ کائنات میں اور جتنے تفکر ہیں جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا ہے۔ فرشتے اور جنّات۔ ان سے انسان کا تفکر اسی طرح متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح انسان خود اپنے تفکر سے متاثر ہوتا ہے۔ قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ لامتناہی تفکر سے تناہی تفکر کو فیضان پہنچاتی رہتی ہے۔ پوری کائنات میں اگر قدرت کا یہ فیضان جاری نہ ہو تو کائنات کے افراد کا یہ درمیانی رشتہ کٹ جائے۔ ایک تفکر کا دوسرے تفکر کو متاثر کرنا بھی قدرت کے اس طرزِعمل کا ایک جزو ہے۔ انسان پابگِل ہے۔ جنّات پابہ ہیولی ہیں، فرشتے پا بہ نور۔ یہ تفکر تین قسم کے ہیں اور تینوں کائنات ہیں۔ اگر یہ تینوں مربوط نہ رہیں اور ایک تفکر کی لہریں دوسرے تفکر کو نہ ملیں تو ربط ٹوٹ جائے گا اور کائنات منہدم ہوجائے گی۔

ثبوت یہ ہے کہ ہمارا تفکر ہیولی اور ہیولی قسم کے تمام جسموں سے فکری طور پر روشناس ہے۔ ساتھ ہی ہمارا تفکر نور اور نور کی ہر قسم سے بھی فکری طور پر روشناس ہے حالانکہ ہمارے اپنے تفکر کے تجربات بالکل ہیں۔ اب یہ بات واضح ہوگئی کہ ہیولی اور نور کے تجربات اجنبی تفکر سے ملے ہیں۔

عام زبان میں تفکر کو انا کا نام دیا جاتا ہے اور انا یا تفکر ایسی کیفیات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کو مجموعی طور پر فرد کہتے ہیں۔ اس طرح کی تخلیق ستارے بھی ہیں اور ذرّے بھی۔ ہمارے شعور میں یہ بات یا تو بالکل نہیں آتی یا بہت کم آتی ہے کہ تفکر کے ذریعے ستاروں ذرّوں اور تمام مخلوق سے ہمارا تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے۔ ان کی انا یعنی تفکر کی لہریں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس قسم کے تبادلہ خیال کا ایک خاندان ہے۔ مخلوق میں فرشتے اور جنّات ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ تفکر کے اعتبار سے ہمارے زیادہ قریب ہیں اور تبادلہ خیال کے لحاظ سے ہم سے زیادہ مانوس ہیں“۔

نانا تاج الدینؒ اس وقت ستاروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے ”کہکشانی نظاموں اور ہمارے درمیان بڑا مستحکم رشتہ ہے۔ پے درپے جو خیالات ہمارے ذہن میں آتے ہیں وہ دوسرے نظاموں اور ان کی آبادیوں سے ہمیں وصول ہوتے رہتے ہیں۔ یہ

خیالات روشنی کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ روشنی کی چھوٹی بڑی شعاعیں خیالات کے لاشمار تصویر خانے لے کر آتی ہیں۔ ان ہی تصویر خانوں کو ہم اپنی زبان میں توہم، خیال، تصوّر اور تفکر وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ ہماری اپنی اختراعات ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تمام مخلوق کی سوچنے کی طرزیں ایک نقطہ مشترک رکھتی ہیں۔ وہی نقطہ مشترک تصویر خانوں کو جمع کر کے ان کا علم دیتا ہے۔ یہ علم نوع اور فرد کے شعور پر منحصر ہے۔ شعور جو اُسلوب اپنی انا کی اقدار کے مطابق قائم کرتا ہے تصویر خانے اس ہی اسلوب کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بتادینا ضروری ہے کہ تین نوعوں کے طرزِ عمل میں زیادہ اشتراک ہے۔ ان ہی کا تذکرہ آسمانی کتابوں اور قرآن پاک میں انسان، فرشتہ اور جنّات کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ نوعیں کائنات کے اندر سارے کہکشانی نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ قدرت نے کچھ ایسا نظام قائم کیا ہے جس میں یہ تین نوعیں تخلیق کا رکن بن گئی ہیں۔ ان ہی کے ذہن سے تخلیق کی لہریں خارج ہوکر کائنات میں منتشر ہوتی ہیں اور جب یہ لہریں معیّن مسافت طے کرکے معیّن نقطہ پر پہنچتی ہیں تو کائناتی مظاہر کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ تفکر، انا اور شخص ایک ہی چیز ہے۔

الفاظ کی وجہ سے ان میں معانی کا فرق نہیں کرسکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ انا، تفکر اور شخص ہیں کیا؟ یہ وہ ہستی ہیں جو لاشمار کیفیات کی شکلوں اور سراپا سے بنی ہیں مثلاً بصارت، سماعت، تکلّم، محبت، رحم، ایثار، رفتار، پرواز وغیرہ۔ ان میں ہر ایک کیفیت ایک شکل اور سراپا رکھتی ہے۔ قدرت نے ایسے بے حساب سراپا لے کر ایک جگہ اس طرح جمع کردیئے ہیں کہ الگ الگ پرت ہونے کے باوجود ایک جان ہوگئے ہیں۔ ایک انسان کے ہزاروں جسم ہوتے ہیں۔ علی ہذالقیاس جنّات اور فرشتوں کی بھی یہی ساخت ہے۔ یہ تینوں ساخت اس لئے مخصوص ہیں کہ ان میں کیفیات کے پرت دوسرے انواع سے زیادہ ہیں۔ کائنات کی ساخت میں ایک پرت بھی ہے اور کثیر تعداد پرت بھی ہیں۔ تاہم ہر نوع کے افراد میں مساوی پرت ہیں۔

انسان لاشمار سیاروں میں آباد ہیں اور ان کی قسمیں کتنی ہیں اس کا اندازہ قیاس سے باہر ہے۔ یہی بات فرشتوں اور جنّات کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ انسان ہوں، جنّات ہوں یا فرشتے، ان کے سراپا کا ہر فرد ایک پائندہ کیفیت ہے۔ کسی پرت کی زندگی جلَی ہوتی ہے یا خفی۔ جب پرت کی حرکت جلَی ہوتی ہے تو شعور میں آجاتی ہے۔ خفی ہوتی ہے تو لاشعور میں رہتی ہے۔ جلَی حرکت کے نتائج کو انسان اختراع و ایجاد کہتا ہے لیکن خفی

حرکت کے نتائج شعور میں نہیں آتے۔ حالانکہ وہ زیادہ عظیم الشان اور مسلسل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ راز غور طلب ہے کہ ساری کائنات خفی حرکت کے نتیجے میں رونما ہونے والے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ البتہ یہ مظاہر مخفی انسانی لاشعور کی پیداوار نہیں ہیں۔ انسان کا خفی کائنات کے دور دراز گوشوں سے مسلسل ربط قائم نہیں رکھ سکا۔ اس کمزوری کو وجہ سے نوع انسان کے اپنے خصائل ہیں۔ اس نے اپنے تفکر کو کس مقصد کے لئے پابگِل کیا ہے یہ بات اب تک نوع انسانی کے شعور سے ماوراء ہے۔ کائنات میں جو تفکر کام کررہا ہے اس کا تقاضا کوئی ایسی مخلوق پورا نہیں کرسکی جو زمانی، مکانی فاصلوں کی گرفت میں بے دست و پا ہو۔ اس شکل میں ایسی تخلیق کی ضرورت تھی جو اس کے خالی گوشوں کو مکمل کرنے کی طاقت رکھتی ہو۔ چنانچہ کائناتی تفکر سے جنّات اور فرشتوں کی تخلیق عمل میں آئی تاکہ خلا پر ہوجائے۔ فی الواقع انسانی تفکر سے وہ تمام مظاہر رونما نہیں ہوسکے جن سے کائنات کی تکمیل ہوجاتی۔

کائنات زمانی مکانی فاصلوں کا نام ہے۔ یہ فاصلے انا کی چھوٹی بڑی مخلوط لہروں سے بنتے ہیں۔ ان لہروں کا چھوٹا بڑا ہونا ہی تغیّر کہلاتا ہے۔ دراصل زمان اور مکان دونوں اسی تغیّر کی صورتیں ہیں۔ دخان جس کے بارے میں دنیا کم جانتی ہے۔ اس مخلوط کا نتیجہ اور

مظاہر کی اصل ہے۔ یہاں دخان سے مراد دھواں نہیں ہے۔ دھواں نظر آتا ہے اور دخان ایسا دھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔ انسان مثبت دخان کی اور جنّات منفی کی پیداوار ہیں۔ رہا فرشتہ، ان دونوں کے ملخّص سے بنا ہے۔ عالمین کے یہ تین اجزائے ترکیبی غیب و شہود کے بانی ہیں۔ ان کے بغیر کائنات کے گوشے امکانی تموّج سے خالی رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ہمارا شعور اور لاشعور حیات سے دور نابود میں گم ہوجاتا ہے۔ ان تین نوعوں کے درمیان عجیب و غریب کرشمہ برسرِعمل ہے۔ مثبت دخان کی ایک کیفیت کا نام مٹھاس ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار انسانی خون میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دخان کی منفی کیفیت نمکین ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار جنّات میں پائی جاتی ہے۔ ان ہی دونوں کیفیتوں سے فرشتے بنے ہیں۔ اگر ایک انسان میں مثبت کیفیت کم ہوجائے اور منفی بڑھ جائے تو انسان میں جنّات کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور وہ جنّات کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی جن میں مثبت کیفیت بڑھ جائے اور منفی کیفیت کم ہوجائے تو اس میں ثقل وزن پیدا ہوجاتا ہے۔ فرشتہ پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ اگر مثبت اور منفی کیفیات معیّن سطح سے اوپر آجائیں تو مثبت کے زور پر وہ انسانی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے اور منفی کے زور پر جنّات کی۔ بالکل اسی طرح اگر انسان میں مثبت اور

منفی کیفیات معیّن سطح سے کم ہوجائیں تو اس سے فرشتہ کے اعمال صادر ہونے لگیں گے۔

طریق کار بہت آسان ہے۔ مٹھاس اور نمک کی معیّن مقداریں کم کرکے فرشتوں کی طرح زمانی مکانی فاصلوں سے وقتی طور پر آزاد ہوسکتے ہیں۔ محض مٹھاس کی مقدار کم کرکے جنّات کی طرح زمانی مکانی فاصلے کم کرسکتے ہیں لیکن ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی روحانی انسان کی رہنمائی اشد ضروری ہے۔

قانون :

یہ قانون بہت فکر سے ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دور کرتے رہتے ہیں، ان میں بہت زیادہ ہمارے معاملات سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قریب اور دور کی ایسی مخلوق سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہو۔ اس مخلوق کے تصوّرات لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان تصوّرات کا جوڑ اپنی زندگی سے ملانا چاہتے ہیں تو ہزارو کوشش کے باوجود ناکام رہ جاتے ہیں۔ انا کی جن لہروں کا ابھی تذکرہ ہوچکا ہے ان کے بارے میں بھی چند باتیں فکر طلب ہیں۔ سائنس دان روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی مکانی فاصلوں کو منقطع کردے۔ البتہ انا کی لہریں لاتناہیت میں بیک وقت ہر جگہ

موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں ان لہروں کے لئے زمانی مکانی فاصلے موجود ہی نہیں ہیں۔ روشنی کی لہریں جن فاصلوں کو کم کرتی ہیں، انا کی لہریں ان ہی فاصلوں کو بجائے خود موجود نہیں جانتیں۔

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی معیّن کر لئے جاتے ہیں، سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو انا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من و عن اسی طرح تبادلہ خیال ہوتا ہے۔

انبیاء اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں۔ ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور

کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے، چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب و شہود کی فراست و معنویت کائنات کی رگ جاں ہے۔ ہم اس رگ جاں میں جو خود ہماری اپنی رگ جاں بھی ہے، تفکر اور توجہ کرکے اپنے سیّارے اور دوسرے سیّاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کرسکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصوّرات، جنّات اور فرشتوں کی حرکات و سکنات، نباتات و جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کرسکتے ہیں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی

کی کتاب

قلندر شعور

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر، عرفانِ حق کے طالب، سائنسی علوم کے ماہر اور روحانی سائنس کے مبتدی طلباء و طالبات کے لئے یہ کتاب مشعلِ راہ ہے۔ قلندر شعور ٹیکنالوجی عقل و شعور کی پرپیچ وادیوں میں سے گزار کر روحانی سائنس کے طلباء و طالبات کو شعوری دنیا سے اُس پار (ماورائی عالم) میں داخل کر دیتی ہے۔ کسی بھی علم کو سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ کتاب ایک روحانی استاد کا کام کرتی ہے اس کتاب کے ذریعہ ہر خاص و عام روحانی علوم سیکھ سکتا ہے۔

A Book authored
by the Proclaimer of Reality
His Divine Grace,

Qalander Baba Auliya

at the Divine command of the
Holy Prophet (Peace and Blessings
of Allah be upon him).

LOH-O-QALAM

This is the first book
of Spiritual Science, the legacy
of prophetic knowledge, the
heritage
of mankind and the detailed
account of Cosmic program,
creative formulae, hitherto
unexplored dimensions of micro
and macro cosmos, all in a most
eloquent and simple worded
narration.

Publishers

Al-kitab Publications, 1-K-5, Nazimabad, Karachi

LEARN TELEPATHY

Brain of every human being is such a remarkable Computer, created by the Nature which consists of 200 Billion components.

When we manage to learn to operate this fabulous inbuilt machine we start seeing beyond the phenomenal world, can communicate telepathy with our near and dear ones living at the far off distances, relay our sentiments for them and receive messages transmitted by them.

Khwaja Shamsuddin Azeemi, the able student of great spiritual scientist His Divine Grace Qalander Baba Auliya, has authored this book 'Learn Telepathy' which is based upon those principles and electro-magnetic formulae which will enable you to enjoy the most sensational experiences of your life.

Covering the various aspects of theory and practice this book presents 'Telepathy' with a pragmatic approach.

Publishers:

Al-kitab Publications, 1-K-5, Nazimabad, Karachi.

یادداشت